ڈاکٹر ذاکر حسین
سیرت و شخصیت

ڈاکٹر ذاکر حسین

سیرت و شخصیت

مرتبہ

عبداللطیف اعظمی

[illegible]

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی

انتساب

جامعہ ملّیہ اسلامیہ

کے نام

عبداللطیف اعظمی

۱۸/مئی سنہ ۶۷ء

نشریات جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی

فہرست مضامین

پیش لفظ

ذاکر صاحب کی محبوب شخصیت اور ان کی گراں قدر تعلیمی خدمات کی شہرت سنہ ۱۹۴۶ء میں جب جامعہ ملیہ کی سلور جوبلی منائی گئی برِصغیر ہند میں دور دور تک پھیل گئی تھی اور اس وقت سے لوگ ان کی زندگی اور ان کے کام کے بارے میں مفصّل معلومات حاصل کرنے کے مشتاق تھے۔ اس کے بعد بیس برس کے عرصے میں موصوف کی قومی اور ملکی خدمات کا دائرہ وسیع اور ان کا مرتبہ بلند ہوتا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کا اشتیاق بھی بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۶۲ء میں جب وہ نائب صدر جمہوریۂ ہند کے منصب پر فائز ہوئے تو افراد، اداروں اور اخباروں کی طرف سے ہم اہلِ جامعہ کے پاس ان کے حالات کے بارے میں بے شمار فرمائشیں آنے لگیں اور ہم حتی الامکان ان کو پورا کرتے رہے۔ اس سلسلے میں یہ احساس پیدا ہوا کہ دراصل ذاکر صاحب کی ایک مفصّل سوانح عمری کی ضرورت ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ کام جتنا اہم اور ضروری ہے اتنا ہی مشکل اور دیر طلب بھی ہے۔ اس لیے مجھے یہ خیال آیا کہ فی الحال کم سے کم ان متفرق مضامین کو جو مختلف حضرات نے ذاکر صاحب کے بارے میں لکھے ہیں یک جا کرکے چھپوا دیا جائے۔ چنانچہ میں نے یہ مجموعہ مرتب کرکے مکتبہ جامعہ کے حوالے کر دیا۔

اب تک ذاکر صاحب پر جس قدر اہم اور قابلِ ذکر مضامین لکھے گئے ہیں، وہ سب کے سب اس مجموعے میں شامل ہیں۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ذاکر صاحب کی

جامع حیثیات شخصیت کا احاطہ کرنے کے لیے یہ مجموعہ کافی نہیں ہے، تاہم اس کی اشاعت سے یہ مضامین، جو بہت خلوص اور محبت سے لکھے گئے ہیں، محفوظ ہو جائیں گے اس سے دو بڑے فائدے ہوں گے، ایک تو بہت سے لوگوں کے ذوقِ طلب کی جو ذاکر صاحب کی سیرت و شخصیت سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے بے چین ہیں، ایک حد تک تسکین ہو جائے گی، دوسرے جب کسی نیک بندے کو ذاکر صاحب کی مکمل اور مبسوط سیرت لکھنے کی توفیق ہوگی تو اسے اس مجموعے سے بہت کچھ مدد ملے گی۔

اس سے قبل مجھے ذاکر صاحب کے تعلیمی خطبات کو مرتب کرنے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ ۱۹۴۲ء سے اب تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں، مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ بھی اسی طرح قبولِ عام حاصل کرے گا۔

جن بزرگوں کے مضامین اس مجموعے کی زینت ہیں، ان کا صمیمِ قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اپنے قیمتی مضامین کو اس مجموعے میں شامل کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ہر مضمون سے قبل محترم مضمون نگار اور ذاکر صاحب کے تعلق پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، اگر کسی کے تعلق کو پورے طور پر پیش نہ کیا جا سکا ہو، تو میں ان کی خدمت میں صدقِ دل سے معذرت پیش کرتا ہوں

جامعہ ملّیہ اسلامیہ۔ دہلی

عبداللطیف اعظمی

۷ مارچ ۱۹۶۶ء

ڈاکٹر ذاکر حسین ـــــــ ایک خاکہ

ہوشیار لوگ برسوں سے اس کوشش میں لگے ہیں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت کا اندازہ کریں۔ کوشش کرنے پر وہ مجبور تھے، اس وجہ سے کہ ذاکر صاحب ممتاز حیثیت کے مالک ہیں اور وہ اپنی کوشش کے نتیجے سے مطمئن بھی ہو گئے، اگرچہ ان کی کامیابی اتنی ہی محدود تھی جتنی کہ ان کی اپنی غرض اور نظر۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر ذاکر حسین کی وہ صفتیں جو وقت کے ساتھ نمایاں ہوئی ہیں، ان لوگوں کو حیرت میں ڈالتی رہی ہیں جو کسی لمبی مدت تک ان کی کارگزاری کو دیکھتے رہے۔ طالب علمی کے زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین بہت ہر دلعزیز تھے۔ لیکن ان کی تعریف کرنے والوں میں کسی کو گمان نہیں تھا کہ ان میں علم حاصل کرنے کا کوئی حوصلہ ہے، ان کی شخصیت میں بڑی کشش تھی، ان کی گفتگو پر لطف تھی، وہ بحث میں تیز تھے، وہ بہت عجیب عجیب اور دلکش حرکتیں کرتے تھے، مثلاً ایک مرتبہ وہ کسی معجون کا ایک پورا مرتبان کھا گئے، اور بڑے بھولے پن سے اس کی وجہ یہ بتلائی، میں کیا کرتا، بھوک لگی تھی اور کھانے کو کوئی اور چیز نہ تھی۔ ان کی تعریف کرنے والوں میں سے کسی کو اس کا بھی خیال نہ ہوا کہ ان کا لاابالی پن ظاہری ہے اور ان کی طبیعت کی گہرائی میں اور بہت کچھ ہے، جس کا پتا نہیں چلتا۔ جب انھوں نے حالات سے اثر لے کر مسلم یونیورسٹی کو چھوڑا اور جامعہ ملیہ کو قائم کرنے میں شریک ہوئے تو ان کے پرانے دوستوں کو تعجب ہوا اور بعض کو افسوس بھی لیکن پھر انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ انھوں نے اپنے لاابالی پن کو چھوڑا نہیں ہے اور پہلے کی طرح مزے مزے کی باتیں کرتے ہیں۔

گویا اسی زمانے سے ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہو گیا تھا، اور وقت کے ساتھ اور مشکل ہوتا گیا۔ دراصل ان کی شخصیت میں کوئی کایا پلٹ نہیں ہوئی تھی، ایسا نہیں ہوا کہ وہ پہلے ایک زندہ دل نوجوان تھے اور بدل کر جوشیلے نیشنلسٹ ہو گئے، یا جوشیلے نیشنلسٹ تھے اور ایسے معلم ہو گئے کہ جسے تعلیم کے سوا، دنیا کے کسی معاملے سے مطلب نہ ہو، یا معلم تھے اور بدل کر ایک ناخدا بن گئے، جو اپنے چھوٹے سے ادارے جامعہ ملیہ کو سیاسی طوفانوں میں سے بچا کر نکال لایا۔ گورنر ہونے کے بعد یا وائس پریسیڈنٹ منتخب ہونے کے بعد وہ اور سب کچھ بھول کر حکومت کے ایک ممتاز رکن نہیں بن گئے۔ ان کی زندگی ایک سیدھا سادا معاملہ ہے۔ قدرتی صلاحیتوں کی بناء پر بیج کے پودے اور پودے کے درخت بنے، ان صلاحیتوں کے رفتہ رفتہ ظاہر ہونے کا، جو موجود تھیں اور بروئے کار نہیں آئی تھیں۔ ۴۷ء کے ہنگامے میں وہ صوفیوں کے اصول کے مطابق دل و جان سے تالیف قلوب میں مشغول ہو گئے اور انھوں نے جامعہ ملیہ کو اس اصول کی ایک زندہ مثال بنا دیا۔ شیخ الجامعہ کی حیثیت سے ان کو اسّی روپے ملتے تھے اور جامعہ ملیہ کی مالی حالت بہت خراب تھی، جب انھیں مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر بننے پر مجبور کیا گیا، لیکن یہ بھی ایک طرح زندگی کے سفر کی ایک منزل تھی۔ یونیورسٹی کا کیمپس بہت جلد ایک دلکش باغ بن گیا، لیکن خود ذاکر صاحب معلوم ہوتا تھا کہ گلابوں کے عاشق ہیں، طرح طرح کے خوبصورت پودے اور جھاڑیاں اور پھول دار درخت، مصوری کے کارنامے اور ارضیات کے لحاظ سے اہم پتھر اور فوسل (FOSSILS) جمع کرنے میں مشغول ہیں۔ جرمنی میں وہ کمپوزیٹر کا کام اور خوشنما طباعت اور جلد سازی کے گر سیکھ چکے تھے اور یہیں انھوں نے موسیقی اور جدید آرٹ کا ذوق پیدا کیا تھا۔ اب تک انھوں نے کسی پرانے شوق کو چھوڑا نہیں ہے، بلکہ لکھتے بھی رہتے ہیں اگرچہ لکھنے کا عمل انھیں ناقابلِ برداشت معلوم ہوتا ہے۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ زندگی کے ہر موڑ پر انھوں نے شوق کی چیزوں میں کوئی نہ کوئی اضافہ کیا اور ہر شوق معلوم ہوتا تھا کہ پرانا ہے اور اس سے دل بستگی کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے خود اسے اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ جب کبھی وہ ایک مقام سے گئے ہیں تو اپنی یادگار کے طور پر ایک باغ چھوڑ گئے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین سے جو بھی ملتا ہے، اس پر ان کی تہذیب اور ان کے انکسار کا فوراً اثر پڑتا ہے۔ انھوں نے ایسی بات کہنا، جس سے کسی کے دل کو دکھ ہو یا کوئی ناگواری ہو، اپنے اوپر حرام کر لیا ہے اور اسی وجہ سے لوگ انھیں اپنی غرض کی خاطر ستاتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اپنی شکست تسلیم کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں اگر ان کی شکست میں تہذیب کی فتح ہو، لیکن یہ صرف ان ہی باتوں میں ہے، جنھیں سپاہ گری کی زبان میں جھڑپ کہتے ہیں۔ بڑے معاملوں میں وہ اپنی ہمت کو تہذیب کی زرہ بکتر پہنا کر بڑے سے بڑے مخالف کا مقابلہ کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ ان کا خلوص ان کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ آدمیوں کو یا تصورات کو شطرنج کے مہرے بنائیں، ان پر ہر شخص بھروسہ کر سکتا ہے، ایسا شخص بھی جو علانیہ ان کا مخالف ہو، لیکن کوئی دوست ہو یا مخالف وہ اس بھروسے کی وجہ سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین میں ایسی انصاف پسندی ہے، جو انھیں مجبور کرتی ہے کہ ہر معاملہ کا دوسرا رُخ بھی دیکھیں اور دیکھنے پر جو چیز ان کو نظر آتی ہے اسے وہ نظر انداز نہیں کرتے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کو جو بھی دیکھتا ہے، وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اتنے قدآور ہیں جتنا کہ ایک مرد آدمی کو ہونا چاہیے، لیکن وہ اپنی قامت کی بلندی کو پوری طرح ظاہر نہیں کرتے۔ انھوں نے ایک عمل کے میدان میں جو علم اور تجربہ حاصل کیا، اسے عمل کا میدان بدلنے کے بعد بھول نہیں گئے۔ ان کے عمل کا میدان بدلتا رہا، لیکن ان کی شخصیت جیسی تھی ویسی ہی رہی اور اس طرح ہر نئے میدان میں وہ تازگی اور جدت کا نمونہ بن کر آئے۔ وائس پریسیڈنٹ کی حیثیت سے ان کی جن غیر ملکی نمایندوں اور اعلیٰ عہدہ داروں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، وہ اکثر یہ دیکھ کر بہت خوش اور متاثر ہوتے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین ان کے یہاں کے پھولوں، درختوں اور پتھروں کے بارے میں ایسی بات جانتے ہیں جو خود انھیں معلوم نہیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے برما کے وزیر اعظم سے ایک پھول دار درخت کا ذکر کیا جو برما میں ہوتا ہے اور جس کا نام وزیر اعظم نے نہیں سنا تھا، تونس میں وہ ایک جلوس کے ساتھ جا رہے تھے، جب انھوں نے دیکھا کہ راستے کے دونوں طرف انار کے ننھے منے درختوں کا حاشیہ ہے، وہ فوراً رک گئے اور جب تک انھیں یہ نہیں معلوم ہو گیا کہ انار کی یہ قسم کیسے پیدا کی جاتی ہے اور کیسے پھیلائی جاتی ہے، وہ آگے نہیں بڑھے، یونان کے بادشاہ سے انھوں نے یونان کے مختلف قسم کے سنگ مرمر پر گفتگو کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

شاہ یونان نے ایک بہت خوشنما ڈبے میں یونان کے سنگ مرمر کے مختلف نمونے بھیجے، سوویت روس کے کچھ سائنس والوں سے ملاقات ہوئی، جنھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو معدنیات کے عجائبات سے بہت دل چسپی ہے، تو انھوں نے واپس جا کر کوہ اورال کے مختلف رنگین کرسٹل پتھروں کا درخت سا بنا کر بھیجا، جو ڈاکٹر ذاکر حسین کے ڈرائنگ روم میں رکھا ہے۔ غیر ملکی عمائدین سے سیاسی گفتگو کی تمہید کے طور پر اگر علم اور شوق کی باتیں ہوں تو دوستی کی ایک فضا پیدا ہو جاتی ہے اور گفتگو کا نتیجہ اتفاق رائے ہو یا اختلاف رائے، اپنے اور غیر میں ایک خالص انسانی رشتہ ضرور قائم ہو جاتا ہے۔

میں نے یہ مضمون اس ارادہ سے لکھنا شروع کیا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کا "چہرہ" مرتب ہو جائے، لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ "چہرہ" کیا خاکہ بھی نہ بن سکا۔ مگر نقش میں صفائی کیسے آسکتی ہے جب دل میں یہ محسوس ہو کہ یہ صفائی ہی نقش کو حقیقت کے خلاف کر دیتی ہے، کسی صفت کو وثوق کے ساتھ کیسے بیان کیا جائے جب ساتھ ہی یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی ایک صفت پر نظر کو قائم کیا جائے تو خصوصیتوں اور اوصاف کا جو مجموعہ ہے اس کی صحت میں فرق آجاتا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ اس کی کوشش کی ہے کہ صاف صاف اور پیچیدار سوال کر کے، ایک نقاد کے انداز سے، جسے تنقید کا اعزاز دیا گیا ہو یا ایک بے تکلف دوست کی طرح معلوم کروں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے عقیدے کیا ہیں، یا ان معاملات میں جنھیں دینی یا روحانی کہا جاتا ہے، ان کا رویّہ یا نقطۂ نظر کیا ہے، لیکن انھوں نے ہمیشہ کوئی لطیفہ بیان کر کے یا ایسی بات کہہ کر جسے وہ جانتے تھے کہ میں صحیح نہ سمجھوں گا، مجھے خاموش کر دیا۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ اس لگاؤ کی تہہ میں جو قومی تعلیم، قومی سیرت اور ہر اس خصوصیت سے جو ایک اچھے شہری اور مہذب انسان میں ہونا چاہیئے، ایک توکل ہے جو تمام موجودات کو اور تمام معاملات کو بے حقیقت سمجھتا ہے اور ایسے ہی میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ اس توکل کی تہہ میں ایک بے چینی ہے، جو کسی وقت بھی شعلہ بن کر نکل سکتی ہے۔ اس توکل اور بے چینی میں کوئی تضاد نہیں ہے، اس لیے کہ یہ توکل کسی منطقی استدلال کا، کسی غور و فکر یا زندگی کے تجربات کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ ایک پرتو ہے دل کی قوت کا، ایک اثر اس صبر کا کہ جس کے بغیر ایمان پختہ نہیں ہوتا اور امید یقین سے محروم رہتی ہے۔ دوسری طرف جو بے چینی ہے، وہ کسی ایک نقطے پر تمام قوتوں کے یک جا ہو جانے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ مختلف میلانات جن کی جڑیں طبیعت کی گہرائی تک پہنچتی ہیں، کس طرح ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت میں

ہم آہنگ ہوتے ہیں اور ان کی گفتگو اور عمل میں ظاہر ہوتے ہیں فطرت اور تہذیب کا ایک معمّہ ہے اور ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ معمّہ رہے گا۔ اسے اس طرح بیان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حل ہو جائے۔ اس کی ایسی تشریح نہیں کی جا سکتی کہ ہم ہر محرک کو الگ کر سکیں، یعنی آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ الفاظ کو جوڑ کر ڈاکٹر ذاکر حسین کا خاکہ مرتب نہیں کیا جا سکتا۔

جامعہ ملّیہ اسلامیہ۔ دہلی
۱۰ / مئی ۱۹۶۷ء

محمد مجیب

کچھ خاندانی حالات

(ذاکر صاحب کی پیدائش ۱۸۹۷ء میں حیدر آباد میں ہوئی، جہاں ان کے والد فدا حسین خاں صاحب بہ سلسلۂ وکالت مقیم تھے، لیکن ان کا اصلی وطن ضلع فرخ آباد (یو۔پی) میں پٹھانوں کی ایک بستی، قائم گنج ہے۔ قائم گنج کا قصبہ محمد خاں بنگش کے بڑے لڑکے اور جانشین قائم خاں کے نام پر آباد کیا گیا تھا۔ اس کا قدیم نام مئو رشید آباد تھا۔ "پرانی ڈانگ" (قدیم قائم گنج) اب بھی اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔

اٹھارھویں صدی کے وسط میں والیانِ فرخ آباد کے ایماء پر آفریدی پٹھانوں کا ایک بڑا جرگہ اس علاقے میں آکر آباد ہوگیا۔ یہ لوگ زیادہ تر سپاہی پیشہ تھے۔ فوجی ملازمت کے علاوہ ان کا شغل زمینداری اور کاشتکاری تھا۔ ذاکر صاحب کے مورثِ اعلیٰ تور کا قبیلے کے "اخون" مذہبی پیشوا کہے جاتے ہیں۔ ان کے دو صاحبزادے حسن اور حسین کے نام سے معروف ہوئے؛ ذاکر صاحب کا سلسلۂ نسب حسین خاں سے ملتا ہے۔ تاحال ان کے خاندان میں "حسین" نام کے جزو کے طور پر قائم ہے۔

ذاکر صاحب کے دادا غلام حسین خاں عرف جھمن خاں ایک باہمت، جری اور سپاہی پیشہ انسان تھے، جنھیں فقراء سے بڑی عقیدت تھی، وہ اپنی آن بان کے لیے جان تک کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ان کی معرکہ آرائی کے کئی قصے آج تک

قائم گنج کے رہنے والوں کو یاد ہیں۔ فقرا سے عقیدت کے سلسلے میں ان کی ایک روایت
بہت مشہور ہے، جب وہ اپنی نئی حویلی تعمیر کرا رہے تھے تو ایک دن عالمِ غضب میں
انھوں نے کچھ مزدوروں کو بہت سخت سست کہا۔ اتفاق سے اس کا علم ان کے
پیرو مرشد کو ہو گیا جنھوں نے انھیں بلا کر فرمایا کہ "جھمن خاں! اگر تم چاہتے ہو کہ
تمھاری نسلیں اس نئے مکان میں پھلیں پھولیں تو ان نازیبا کلمات کے کفارہ کے لیے
متھرا کا سفر اختیار کرو اور فلاں بھگت (سادھو) کی سنگت میں کچھ دن گزارو، جب
تمھاری روح، غضب کی کثافت سے دور ہو جائے تو پھر واپس آن کر مکان کی تعمیر کو
مکمل کرنا۔" مرشد کے اس فرمان کو تیکھے پٹھان نے حرف بہ حرف پورا کیا۔ نہایت
مختصر سے زادِ راہ کے ساتھ یہ کرشن کی اس نگری کی طرف چل کھڑے ہوئے، جہاں
بھگتی اور عرفان کے سوتے پھوٹتے رہے ہیں اور امتحان میں پورے اُتر کر واپس
آئے، اور مکان کی تعمیر میں مصروف ہو گئے۔

غلام حسین خاں کے دو صاحبزادے تھے، عطا حسین خاں اور فدا حسین خاں۔
عطا حسین خاں دکن میں فوج میں رسالدار تھے، چھوٹے صاحبزادے فدا حسین خاں
نے ابتدائی تعلیم قائم گنج میں حاصل کی۔ اس کے بعد بڑے بھائی کے ایما سے تجارت
کے لیے حیدر آباد کا رُخ کیا۔ لیکن حیدر آباد کے علمی ماحول میں ان کا تحصیلِ علم کا
شوق بھڑک اٹھا اور تجارت کے ساتھ ساتھ انھوں نے شب و روز محنت کر کے
وکالت کا امتحان پاس کر لیا۔ فدا حسین خاں غیر معمولی ذہانت اور فراست کے انسان
تھے۔ افسوس ہے کہ انھوں نے بہت کم یعنی صرف ۳۹ سال کی عمر پائی۔ اور اس طرح
بہ مشکل ۱۵ سال وکالت کر سکے۔ مگر اس مختصر مدت میں انھوں نے اس پیشے
میں بڑا نام پیدا کیا اور اتنا کمایا کہ ایک بڑی پختہ حویلی قائم گنج میں بنوائی، اور کئی
زمینداریاں خریدیں۔ ان کے علاوہ اپنی سکونت کے لیے ایک بڑی کوٹھی حیدر آباد
شہر میں مول لی۔ اسی مکان میں ذاکر صاحب کی ولادت ہوئی۔

ذاکر صاحب ابھی ابتدائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھے کہ ان کے والد
فدا حسین خاں صاحب کے انتقال کی وجہ سے خاندان کا شیرازہ بکھر گیا۔
فدا حسین خاں کے سات لڑکے پیدا ہوئے، مظفر حسین خاں، عابد حسین خاں،

ذاکر حسین خاں، زاہد حسین خاں، یوسف حسین خاں، جعفر حسین خاں اور محمود حسین خاں۔ ان میں سے جعفر حسین خاں نے بچپن میں وفات پائی۔ مظفر حسین، عابد حسین اور زاہد حسین نے جو علی گڑھ یونیورسٹی کے ممتاز ترین طلباء میں سے تھے، عین عالم جوانی میں انتقال کیا۔ ان میں سے صرف بڑے بھائی مظفر حسین خاں کی اولاد دو لڑکے اور ایک لڑکی زندہ ہیں۔ ذاکر صاحب کے دو بھائی ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور ڈاکٹر محمود حسین خاں علمی اور تعلیمی کاموں میں مصروف ہیں، دونوں متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اوّل الذکر جامعہ عثمانیہ حیدر سے ریٹائر ہونے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر تھے۔ آجکل شملہ کے ایک مشہور ادارہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی میں پروفیسر ہیں اور تصنیف و تالیف کا شغل ہے۔ محمود حسین خاں کراچی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ اس سے قبل وہ پاکستان کی مرکزی حکومت میں وزیر رہ چکے ہیں۔

پروفیسر حبیب الرّحمٰن

پروفیسر حبیب الرّحمٰن، ذاکر صاحب کے، ہائی اسکول اور کالج کی تعلیم کے وقت، ہم سبق تھے اور جب ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرّر ہوئے تو وہ شعبۂ تعلیم (ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ) کے سربراہ تھے۔ ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد انھوں نے علی گڑھ میں یونیورسٹی کے علاقے میں سکونت اختیار کر لی تھی افسوس کہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۶ء کو ستّر سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔

تعلیمی دور

ذاکر صاحب کو میں ۱۲ء سے جانتا ہوں، جب وہ اور میں اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں پڑھتے تھے، ذاکر صاحب کو ان کے پُرانے ایم، اے، او کالج کے ساتھی مرشد کہتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں، لیکن ذاکر صاحب اسکول کے زمانے میں بھی اپنے اسکول کے ساتھیوں کے مرشد تھے، ہر طالب علم ان کی بے انتہا عزّت کرتا تھا اور ان کی تقلید کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ جس زمانے میں ذاکر صاحب اور میں اسلامیہ اسکول اٹاوہ میں پڑھتے تھے، ترکی اور اٹلی میں جنگ ہو رہی تھی، ذاکر صاحب کی تحریک پر ہم لوگوں نے گوشت کھانا بند کرایا، تاکہ جو روپیہ بچے وہ ترکوں کی مدد کو بھیجا جائے۔ مرشد کو اس زمانے میں بھی انگریزی اخبار پڑھنے کا شوق تھا، "پانیر" معیاری اخبار سمجھا جاتا تھا انھیں جلد سے جلد خبریں معلوم کرنے کی اتنی فکر اور اس قدر اشتیاق رہتا کہ وہ "پانیر" روزانہ خریدنے کے لیے اٹاوہ کے اسٹیشن جاتے، آگے وہ ہوتے پیچھے میں، اسٹیشن پر اخبار اُترتے ہی، ذاکر صاحب اسے حاصل کرتے اور پھر وہ اور میں تقریباً بھاگتے ہوئے اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں واپس آتے، وہاں طالب علم منتظر ہوتے، ہمارے واپس آتے ہی، وہ ہمارے چاروں طرف حلقہ بنا لیتے۔ ذاکر صاحب انھیں خبروں کا نہ صرف ترجمہ کرکے سُناتے، بلکہ ان پر تبصرہ بھی فرماتے۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر الطاف حسین صاحب ذہین اور ہونہار طالب علموں کو اپنی ذاتی توجہ کا مرکز بنا لیتے تھے، یہ طالب علم جن میں ذاکر صاحب سب سے زیادہ نمایاں تھے، اپنا کافی وقت ہیڈ ماسٹر صاحب کے مکان پر صرف کرتے

اور ہیڈ ماسٹر صاحب مختلف سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل پر ان طالب علموں کے ساتھ ایسے دل چسپ انداز میں گفتگو کرتے تھے کہ ان میں ان مسائل کے متعلق کافی بصیرت پیدا ہو جاتی تھی اور ان کے علم اور واقفیت میں کافی اضافہ ہوتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی ان مجلسوں اور بحثوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ذاکر صاحب کی عام واقفیت سیاسی مسائل کے متعلق اتنی وسیع ہو گئی کہ بیشتر اعلیٰ تعلیم حاصل کیے ہوئے لوگ جو ان سے دوگنی عمر کے تھے، ان مسائل کے متعلق ان جیسی بصیرت نہ رکھتے تھے، اس بصیرت کا یہ نتیجہ بھی ہوا کہ ان میں بین الاقوامی اور قومی معاملات کے متعلق صحیح جذبات اور رجحانات بھی پیدا ہو گئے۔ اور ہندوستان کے باہر دوسرے مسلم ممالک سے ان کی گہری ہمدردی بھی راسخ ہو گئی۔

اس ہمدردی کا مظاہرہ مختلف طریقوں سے ہوتا تھا۔ گوشت کا ترک اور دوسرے طالب علموں کو بھی اس پر آمادہ کرنا اس کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ نماز جمعہ کے بعد ذاکر صاحب نمازیوں سے مظلوم ترکوں کے لیے چندہ وصول کرتے۔ ایک مرتبہ اٹاوہ کی ایک مسجد میں ذاکر صاحب نے ایک تقریر کی، اس کے بعد انھوں نے اپنی بے پھندنے کی ترکی ٹوپی میں چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ چندہ وصول کرتے وقت انھوں نے فرمایا۔ "لائیے لائیے حضرات! جو تانبے کے پیسے اس ٹوپی میں ڈالیں گے، وہ سیسے کی گولیوں میں تبدیل ہو کر دشمن کے سینے کے پار ہوں گے"۔ ایک سفید ریش بزرگ پر اس جملے کا یہ اثر ہوا کہ وہ چیخ چیخ کر رونے لگے اور اپنا پورا بٹوہ ذاکر صاحب کی ٹوپی میں الٹ دیا۔ ہر مرتبہ اچھی خاصی رقم جمع ہو جاتی اور پھر ذاکر صاحب ڈاک خانے کا رخ کرتے اور اس رقم کو منی آرڈر کے ذریعے سے ترکوں کی مدد کے لیے بھیج دیتے۔

ذاکر صاحب کی شخصیت سے میں اتنا متأثر تھا کہ مغرب کی نماز کے بعد دعا کیا کرتا تھا کہ میں بھی ان جیسا ہو جاؤں۔ چند سال ہوئے میں نے ایک دن ان سے کہا کہ ذاکر صاحب میں اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں یہ دعا مانگا کرتا تھا کہ میرا دماغ آپ کے دماغ جیسا ہو جائے، لیکن دعا قبول نہ ہوئی۔ فوراً ہنس کر فرمایا "واہ دعا تو قبول ہو گئی، خدا نے آپ کو مجھ سے بھی اچھا دماغ دے دیا"۔

ذاکر صاحب اسکول میں مجھ سے ایک جماعت اوپر تھے، میں نویں میں تھا وہ

دسویں میں۔ انٹرمیڈیٹ میں انھوں نے بھی سائنس اختیاری مضمون کی حیثیت سے لیا اور میں نے بھی، لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے انھوں نے انٹرمیڈیٹ میں کامیاب ہونے کے بعد ایک سال کے لیے پڑھائی چھوڑ دی اور بی۔ اے میں وہ اور میں ہم جماعت ہو گئے، ہم دونوں کے مضامین ایک ہی تھے، یعنی انگریزی ادب، فلسفہ اور معاشیات۔ میں ان تین مضامین کے علاوہ اور کسی مضمون کی کوئی کتاب نہ پڑھتا، امتحان میں کامیابی حاصل کرنا میرا مقصد ہوتا، ذاکر صاحب درسی کتابوں کو مطلق اہمیت نہ دیتے، لیکن ان کے علاوہ مختلف مضامین کی کتابیں خوب پڑھتے، امتحان سے چند روز قبل مجھ سے کہتے کہ میں نے جو درسی کتابوں کے خلاصے تیار کیے ہیں ان کو دے دوں، کسی اور طالب علم کو میں یہ خلاصے ہرگز نہ دیتا، لیکن ذاکر صاحب کو بہ خوشی دے دیتا، ہفتہ دو ہفتے ان خلاصوں میں بنیادی اور اہم نکات وہ فوراً نکال لیتے اور انھیں اس خوبی کے ساتھ ذہن نشین کر لیتے کہ میرے ذہن میں تو مواد کی زیادتی کی وجہ سے بعض مسائل اُلجھ جاتے، لیکن ان کے ذہن میں صرف ضروری چیزیں نہایت منظم شکل میں محفوظ ہو جاتیں۔ تھرڈ ایر میں انھیں میرے خلاصے پڑھنے کے لیے تقریباً ایک ہفتہ ملا، اس لیے تھرڈ ایر کے سالانہ امتحان میں تو میں ان سے آٹھ نمبر زیادہ حاصل کر کے اتفاق سے اوّل رہا اور وہ دوئم، لیکن فورتھ ایر میں انھیں میرے تیار کردہ خلاصوں کا مطالعہ کرنے کے لیے تقریباً پندرہ دن مل گئے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے بی۔ اے کے امتحان میں میں اور وہ اوپر کے ان پانچ طلبا میں تھے، جنھیں یونیورسٹی کا وظیفہ ملا، لیکن وہ مجھ سے اوپر تھے اس لیے الہ آباد یونیورسٹی کا اقبال مڈل انھیں ملا اور ہر چند کہ امتحان کی میری تیاری ان سے بہت زیادہ تھی میں دیکھتا رہ گیا۔ خدا نے انھیں ایسا دماغ عطا کیا ہے کہ فوراً بہت سے مواد کا تجزیہ کر کے اس میں سے اہم عناصر نکال لیتے ہیں، اور دماغ میں ان کی بہترین تنظیم کر لیتے ہیں۔ تعلیم کے مضمون پر میں نے ان کے مقابلے میں بہت زیادہ کتابیں پڑھی ہیں، لیکن مجھے اس کا اعتراف کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ تعلیم کے مختلف مسائل کے متعلق جس قدر سلجھے ہوئے اور صحیح خیالات ان کے ہیں، میرے نہیں۔

طالب علمی کے زمانے کے بیسیوں واقعات ایسے ہیں جن سے ان کے ذہن

بلندی اور گہرائی اور ان کی شخصیت کی عظمت ثابت ہوتی ہے۔ اس مختصر مضمون میں
ن کا بیان کرنا نہ ممکن ہے نہ ضروری۔ ان کے دوسرے ساتھی ان کی زندگی کے بیسیوں
یسے واقعات بیان کریں گے، جن سے ان کی ذہنی اور اخلاقی خصوصیات پر روشنی
پڑے گی۔

ذاکر صاحب نے عدم تعاون کے زمانے میں ایم۔ اے۔ او کالج کو چھوڑ دیا اور
جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شریک ہو گئے اور اس کے کچھ عرصے کے بعد جرمنی تشریف
لے گئے۔ جامعہ کے قیام میں انھوں نے جو جد و جہد کی، اس کے متعلق جامعہ کے لوگ
مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ ان کی ان تعلیمی کوششوں کو میں دور سے دیکھتا رہا ہوں۔
وقتاً فوقتاً جب ان سے ملنے کا موقع ملا، ہمیشہ بڑی محبّت سے ملے۔

مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہونے پر میں مبارک باد دینے کے لیے گیا،
کہنے لگے، آپ لوگوں نے وائس چانسلری کی اہم ذمّے داریاں مجھ پر عاید کی ہیں لیکن،
میری کامیابی آپ لوگوں کے تعاون پر منحصر ہے۔

ذاکر صاحب وائس چانسلری کے زمانے میں چند اصولوں پر سختی اور پابندی سے
عامل رہے۔ (۱) جہاں تک ممکن ہو اساتذہ اور طلباء کا تعاون حاصل کیا جائے۔
(۲) دوسرے لوگوں کے نظریوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اور ان نظریوں کے
متعلق ہمدردانہ رویّہ رکھا جائے۔ (۳) جن لوگوں میں عیوب ہیں ان کے متعلق
مایوسی کا رویّہ نہ رکھا جائے، بلکہ دوستی اور محبّت کے ذریعے ان کی اصلاح کی جائے۔
(۴) اپنے ساتھیوں اور ماتحتوں کا اعتبار کیا جائے۔ (۵) جہاں تک ممکن ہو کسی کو
ذہنی ایذا نہ دی جائے۔

مندرجہ بالا اصولوں پر عمل کرنے کی مجھے بہت سی مثالیں ملیں۔ ایک دن ان کے
ساتھ میں ان کے باغ میں ٹہل رہا تھا، میری نظر چند گلاب کے پودوں پر پڑی جو اچھے
نہ تھے، میں نے کہا کہ "ذاکر صاحب! ان گلابوں کو کھدوا کر پھینک دیجیے اور عمدہ قسم
کے گلاب کے پودے لگوائیے۔" ہنس کر فرمایا "بھائی، مجھ سے یہاں کے اسٹاف
کے بعض لوگوں کے متعلق لوگ یہی کہتے ہیں، میں ان سے کہتا ہوں کہ جو لوگ موجود ہیں
وہ تو رہیں گے، ان سے اچھے لوگ جو ملیں گے انھیں بھی یونیورسٹی میں جگہ ملے گی۔"

ذاکر صاحب کا مستقل نظریہ یہ رہا ہے کہ بُروں کی طرف سے مایوس نہ ہوا جائے، اگر ان کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا رویہ رکھا جائے گا تو وہ اپنی اصلاح خود کرلیں گے۔ اسی اصول پر کاربند رہ کر انھوں نے کسی کو نقصان پہنچنے نہ دیا۔ جن لوگوں میں کسی قسم کی خامی تھی، وہ ان کی شرافت سے متأثر ہو کر اپنی اصلاح کی خود کوشش کرتے تھے۔

اکثر مواقع پر میں نے بعض لوگوں کے متعلق بے زاری اور مایوسی کا اظہار کیا، اور شروع میں مجھے کسی قدر مایوسی ہوتی تھی جب میں دیکھتا تھا کہ ذاکر صاحب میری بے زاری سے متأثر نہیں ہوتے تھے، لیکن کچھ عرصے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ انسانی فطرت کی اصلاح پذیری پر مجھ سے زیادہ اعتماد رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ مجھ سے کہنے لگے، اگر آپ کو میرے متعلق رپورٹ لکھنے کا موقع ملے تو آپ بڑی سخت رپورٹ لکھیں گے۔ ان کے اس جملے پر کئی دن تک غور کرتا رہا اور ان کے اور اپنے نظریے کے فرق کو محسوس کیا، یعنی انسانی فطرت کے درست ہونے کے امکان کے متعلق اپنا عدم اعتماد اور ان کا مکمل اعتماد، آخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کا نظریہ صحیح اور میرا غلط۔

ذاکر صاحب اور میرے درمیان بعض موقعوں پر اختلافِ رائے ہوا، جو وقتی کبیدگی کا باعث ہوا۔ لیکن یہ کبیدگی ہمیشہ سطحی رہی، ان کے دل کی گہرائیوں میں اپنے پُرانے ساتھیوں کے لیے ہمیشہ محبت اور ہمدردی کا بے پناہ جذبہ موجزن رہا ہے اور انھوں نے آسانی کے ساتھ ان کی تمام لغزشیں اور خامیاں نظرانداز کی ہیں۔ نہ صرف ان کے پُرانے ساتھیوں کو بلکہ ان تمام لوگوں کو جنھیں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، ہمیشہ یہ زعم رہا ہے کہ اگر ہم سے کوئی غلطی ہوگی تو ذاکر صاحب ہم سے اتنی سختی سے حساب فہمی نہ کریں گے کہ ہماری زندگی دوبھر ہو جائے۔

ڈاکٹر سیّد عابد حسین

آیندہ صفحات میں ڈاکٹر سیّد عابد حسین صاحب کا ایک مضمون شائع کیا جا رہا ہے۔ جس میں بقول فاضل مضمون نگار، ذاکر صاحب کی شخصیت کی نشو و نما کا ایک سرسری خاکہ کھینچا گیا ہے۔ یہ مضمون "نقوش" (لاہور) کی شخصیات نمبر میں جنوری ۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔ محترم مضمون نگار نے میری درخواست پر اس مضمون میں ضروری ترمیم و اضافہ کیا ہے اور ۵۵ء کے بعد کے حالات کا اضافہ کر کے اس 'سرسری' خاکہ کو مکمل کر دیا ہے۔

ڈاکٹر عابد صاحب ذاکر صاحب کے ان دوستوں میں سے ہیں، جن کا موصوف سے گہرا اور دیرینہ تعلق ہے۔ عابد صاحب کی ذاکر صاحب سے پہلی ملاقات علی گڑھ میں ہوئی تھی، جب دونوں طالب علم تھے، اس کے بعد برلن (جرمنی) میں۔ جہاں ذاکر صاحب معاشیات میں اور عابد صاحب فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کر رہے تھے۔ کئی برس ساتھ رہے جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ جب ذاکر صاحب جامعہ واپس آئے تو اپنے ساتھ عابد صاحب کو بھی لائے۔ عابد صاحب جامعہ کے ممتاز خادموں اور ذاکر صاحب کے مخصوص ساتھیوں میں سے ہیں۔ اگرچہ اب دونوں بزرگ جامعہ سے الگ ہو چکے ہیں مگر اس ادارے سے ان کا تعلق اب بھی ہے اور ان کے باہمی تعلّقات بدستور قائم ہیں۔ اس لیے ذاکر صاحب کی سیرت اور شخصیت پر مضمون لکھنے کا حق پروفیسر مجیب صاحب کے علاوہ ڈاکٹر عابد صاحب کو ہے۔

ذکرِ ذاکر

شخصیت کیا ہے؟ اس پر مفصل بحث کرنے کا اس وقت موقع نہیں، مجمل طور پر یوں سمجھ لیجیے کہ شخصیت ان جسمانی اور اخلاقی صفات کا ایک ہم آہنگ مجموعہ ہے، جن کی بدولت کوئی شخص عام لوگوں سے امتیاز حاصل کرتا ہے اور ان پر اثرانداز ہوتا ہے۔ بعض اوقات ہم شخصیت کے مالک یعنی اس انسان کو بھی جو غیر معمولی جسمانی اور اخلاقی صفات رکھتا ہے شخصیت کہہ دیتے ہیں۔ اس مضمون میں شخصیت کا لفظ ضرورت کے مطابق دونوں معنوں میں استعمال ہوگا۔

یہ بات تو شخصیت کی تعریف ہی میں داخل ہے کہ وہ اپنے ماحول پر اثرانداز ہوتی ہے، البتہ اس بارے میں بہت کچھ اختلاف ہے کہ اس کے اثر کی کیا حدود ہیں۔ اکبر نے کہا ہے

ع مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

اور اقبال نے تو شخصیت کو (جسے وہ خودی کہتے ہیں) خدائی کی حد کے قریب پہنچا دیا ہے، مگر ایسے لوگ بھی ہیں جن کے نزدیک شخصیت سراسر اپنے زمانے یا ماحول کی پیداوار ہوتی ہے، عام طور پر تصوریت (IDEALISM) کے علم بردار اس کے قائل ہیں کہ شخصیت اپنے ماحول پر غیر محدود اثر ڈال سکتی ہے اور بہت بڑی شخصیتیں واقعی قوموں کی زندگی اور زمانے کے دھارے کو بدل سکتی ہیں۔ مگر ثبوتیت

POSITIVISM کے پیرو یہ سمجھتے ہیں کہ بڑی سے بڑی شخصیت کا اثر بھی محدود ہوتا ہے، بلکہ خود شخصیت اپنے طبیعی، سماجی اور سب سے زیادہ معاشی ماحول کے سانچے میں ڈھل جایا کرتی ہے۔ فلسفیوں کی افراط تفریط سے بچ کر تاریخ کا بے لاگ مطالعہ کرنے والا جانتا ہے کہ شخصیت اس انجن کی طرح ہے جس سے بڑی بڑی اصلاحی یا انقلابی تحریک کی گاڑی کھینچی جا سکتی ہے، لیکن خود یہ انجن جس طاقت سے چلتا ہے وہ اسے زمانے یا ماحول سے ملتی ہے۔ ایسی شخصیتیں جن میں اصلاح یا انقلاب پیدا کرنے کی صلاحیت ہے کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں، لیکن ان کی صلاحیت کا قوت سے فعل میں آنا اس پر موقوف ہے کہ ان کے زمانے کے حالات اور زمانے کے لوگ ان کا ساتھ دیں۔

ہم نے اپنے زمانے یعنی بیسویں صدی کے نصف اوّل میں جن مسلمانوں کو لوحِ تاریخ پر نمودار ہوتے دیکھا تھا، ان میں کھری شخصیتیں بھی تھیں اور ملمع کی بھی تھیں۔ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر ملمع کا مال کھرے مال سے کہیں زیادہ مقبول ہوا، اس لیے کہ اس میں ظاہری چمک جس پر مسلمان جان دیتے ہیں زیادہ تھی۔ ذاکر صاحب ان کھری شخصیتوں میں سے ہیں جن کی مقبولیت کا دائرہ شروع میں بہت محدود تھا، لیکن آگے چل کر ملمع کی عارضی چمک ماند پڑنے لگی ہے اور کھرے سونے کی پائدار دمک بدستور موجود رہی۔ ممکن ہے اب ہندوستان کے مسلمان ذاکر صاحب کی شخصیت کو پرکھ سکیں۔

ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

اور ان کی مدد کے لیے ذاکر صاحب کی شخصیت کی نشو ونما اور موجودہ آب و رنگ پر تھوڑی سی روشنی ڈالتے ہیں۔

ذاکر حسین ۱۸۹۷ء میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد فدا حسین خاں ضلع فرخ آباد (یو۔پی) کے مشہور قصبے قائم گنج کے رہنے والے تھے اور حیدر آباد میں وکالت کرتے تھے۔ قائم گنج کے پٹھان صدیوں سے سپہ گری کا پیشہ رکھتے تھے، چنانچہ ذاکر حسین کے خاندان کے بھی بہت سے لوگ فوج میں ملازم تھے، ان کے والد کا مشرقی علوم کی اعلیٰ تعلیم پانا اور وکالت کا پیشہ اختیار کرنا قائم گنج والوں کے نزدیک بدعت سے کم نہ تھا۔

ذاکر حسین کا بچپن حیدر آباد میں گزرا، لیکن وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں پلے اور بڑھے اور ریاست کی جاگیردارانہ آب و ہوا سے متأثر نہیں ہوئے۔ اس زمانے میں سب سے گہرا اثر ان کی سیرت پر اپنے پیر حسن شاہ صاحب کا پڑا، جن کے وہ بہت کم عمری میں مرید ہو گئے تھے۔ یہ بزرگ ذاکر حسین کے عزیزوں میں سے اور حضرت شاہ طالب حسین فرخ آبادی سے ارادت رکھتے تھے، حسن شاہ صاحب پر ایک واردات ایسی گزری تھی جس سے ان کی روحانی زندگی کی کایا پلٹ گئی، ابتدا میں وہ ہندوؤں سے تعصب رکھتے تھے اور شاید انھیں برا بھلا بھی کہتے تھے، جب ان کے مرشد حضرت طالب حسین کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے ان کی تادیب اور تہذیب کے لیے یہ حکم دیا کہ تم چوٹی رکھو اور پشاور تک پیدل جاؤ اور واپس آؤ، اس تادیب نے حسن شاہ صاحب کو آزادہ روی اور صلح کل سکھانے کے علاوہ جہانیانِ جہاں گشت بنا دیا اور ان کا یہ شعار ہو گیا کہ ایک گٹھری کپڑوں اور کتابوں کی ساتھ لیے پیدل دنیا بھر میں پھرا کرتے، جب کبھی حیدر آباد آکر کچھ دن رہتے تو ذاکر حسین کی ہدایت و ارشاد کا کام زیادہ تر ان دو طریقوں سے انجام دیتے، ایک تو وہ کم سن مرید سے علمِ دین یا سلوک و معرفت کی کسی کتاب کی نقل کراتے، دوسرے اسے روپیہ دیتے اور پھر حاجتمندوں کو اس کے پیچھے لگا دیتے کہ خیرات و حسنات کی مشق سے ان کا دل بھی کھل جائے اور ہاتھ بھی۔

۱۹۰۷ء میں ذاکر حسین تعلیم کے لیے اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں بھیج دیے گئے، جسے سید احمد خاں کے ایک دور کے رفیق مولوی بشیر الدین نے قائم کیا تھا۔ ان بزرگ کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ انھیں ایک ہی دھن تھی اور اپنی دھن کے پکے تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین ان "سچے" معلموں میں سے تھے جو اس راز سے واقف ہوتے ہیں:

درسِ ادب اگر بود زمزمۂ محبتش
جمعہ بہ مکتب آورد طفلِ گریز پائے را

ذاکر حسین کے حساس دل پر مولوی صاحب کی ایک صفت اور سید صاحب کی بہت سی صفات کا بڑا گہرا نقش بیٹھا جو کبھی مٹ نہ سکا۔ ۱۹۱۳ء میں ذاکر حسین

ایم، اے، او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے، انٹرمیڈیٹ انھوں نے سائنس میں پاس کیا اور ۱۹۱۵ء میں بی ایس سی کا امتحان دینے کے لیے لکھنؤ کرسچین کالج میں داخل ہوئے تاکہ میڈیکل کالج میں داخلہ لے سکیں، لیکن شدید علالت کی وجہ سے اس ارادہ کو ترک کرکے پھر علی گڑھ واپس آنا پڑا، اس طرح ان کا ایک سال بے کار ہوگیا، اس بار انھوں نے آرٹس کا کورس لیا، ۱۹۱۸ء میں بی۔ اے اور ۱۹۱۹ء میں اقتصادیات کے مضمون میں ایم۔ اے پری ویس پاس کیا۔ ایم۔ اے کی تیاری کے ساتھ ساتھ ذاکر حسین اقتصادیات کے شعبے میں جونیر لکچرار کے فرائض انجام دے رہے تھے کہ علی گڑھ میں ترکِ موالات کا زلزلہ آیا۔ جس سے سید احمد خاں کا ایم۔ اے۔ او کالج زیر و زبر ہوکر ڈاکٹر ضیاء الدین کی مسلم یونیورسٹی بن گیا۔ کچھ لوگوں نے گرتی ہوئی عمارت سے نکل کر ایک خیموں کی بستی میں پناہ لی اور اس کا نام جامعہ ملّیہ اسلامیہ رکھا۔ ان پناہ گزینوں میں ذاکر حسین بھی تھے، جو اب ذاکر صاحب کہلانے لگے تھے۔ علی گڑھ کالج کی تعلیم کے دوران میں ذاکر حسین یونین کے اور عام طور پر طالب علموں کی اجتماعی زندگی کے روحِ رواں تھے، انھوں نے اپنے بہت سے ساتھیوں پر گہرا اثر ڈالا۔ لیکن خود سب سے گہرا اثر ڈاکٹر ضیاء الدین کا قبول کیا۔ گو وہ مثبت نہیں منفی اثر تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی ذات ان سب صفات کا مجموعہ تھی جن سے سرکارِ برطانیہ کا تقرب اور صنادید قوم میں مقبولیت حاصل ہوتی تھی، ذاکر صاحب نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ڈاکٹر ضیاء الدین کی پیرویِ معکوس کو اپنی زندگی کا اصول بنالیا۔ ۱۹۲۰ء میں جب گاندھی جی اور مولانا آزاد نے علی گڑھ کے طلباء کو ترکِ موالات کی دعوت دی تھی اور مولانا محمد علی نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم کے دستِ مبارک سے جامعہ ملّیہ کا افتتاح کرایا تھا تو ذاکر صاحب کے لیے ایم، اے، او کالج کو چھوڑ کر جامعہ ملّیہ میں شریک ہونے کا فیصلہ کرنا نہایت دشوار معلوم ہورہا تھا، کئی روز شدید کشمکش میں مبتلا رہے، مگر ایک دن جب ڈاکٹر ضیاء الدین نے انھیں بلاکر بڑی محبت سے زندگی کے نشیب و فراز سمجھائے اور یقین دلایا کہ ایم، اے، او کالج میں رہ کر تم کو ایک ہی سال کے اندر ڈپٹی کلکٹری مل جائے گی تو ذاکر صاحب کی مشکل آسان ہوگئی، وہ فوراً ایم، اے، او کالج کو خیرباد کہہ کر جامعہ ملّیہ پہنچ گئے۔

وڈو سال تک جامعہ ملیہ کی تعمیر میں مولانا محمد علی کا ہاتھ بٹانے کے بعد ۱۹۲۲ء
میں ذاکر صاحب معاشیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے برلن پہنچے۔ میری ملاقات ان سے
ایک مرتبہ علی گڑھ میں ہو چکی تھی، لیکن اب سوا تین برس تک میرا ان کا ساتھ رہا۔
میں نے انھیں ہر رنگ میں دیکھا اور ہر رنگ میں چوکھا پایا۔ سب سے زیادہ مجھ پر اس بات
کا سکہ بیٹھا کہ ذاکر صاحب "درایام جوانی چناں کہ افتد و دانی" کی وادیٔ پُرخار سے
بڑی پامردی سے گزرے، گھبرا کر بھاگنے کی کوشش میں کانٹوں میں اُلجھے نہیں بلکہ
اوسان قائم رکھے، دامن بچائے قدم بڑھائے چلے گئے۔ برلن میں ذاکر صاحب کے
استادوں میں پروفیسر زومبارٹ (SOMBART) اور دوسرے بڑے پائے
کے عالم تھے جن سے انھوں نے بہت فیض اٹھایا، مگر فیضان اگر تھوڑا بہت کسی سے
پایا تو شاید میرے اُستاد اشپرانگر (SPRANGER) سے جو خبر کے ساتھ ساتھ
نظر بھی رکھتے ہیں۔

۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب جرمنی سے ڈاکٹر ذاکر حسین بن کر لوٹے تو ملک کی یہ
کیفیت دیکھی کہ ترکِ موالات اور خلافت کی تحریکیں ٹھنڈی پڑ چکی تھیں اور خصوصاً
مسلمانوں پر ایک عام افسردگی چھائی ہوئی تھی۔

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

مگر ایک آواز اب بھی سُنائی دے رہی تھی اور وہ خود ان کے دل کی آواز تھی۔

بے گانہ ہوئی دُنیا رسم و رہِ الفت سے
اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

یہ سخت جان طبیعت باز نہیں آئی، اس نے جامعہ ملیہ کی سوکھتی ہوئی بیل کو خونِ جگر سے
سینچا اور پروان چڑھایا۔ ۱۹۲۷ء کے آخر میں حکیم اجمل خاں کے انتقال کے بعد
جامعہ ملیہ کا چلنا قریب قریب ناممکن نظر آتا تھا، جن لوگوں نے ان دنوں ذاکر صاحب
کے ساتھ کام کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ وسائل کے فقدان، اپنوں کی مخالفت،
غیروں کی شماتت، حکومت کے عتاب کے باوجود جامعہ ملیہ کو چلانا ہر ایک کا کام نہیں تھا۔
یہ وہی کر سکتا تھا، جسے خدا پر، انسان پر اور خاص کر اپنے آپ پر سچا، پورا اور گہرا

بھروسہ ہو۔ جو ایثار ذاکر صاحب نے جامعہ ملّیہ کے لیے کیا، اس میں تن من دھن کی قربانی تو سب کو نظر آئی، مگر ایک قربانی جو حوصلہ مند طبیعتوں کے لیے ان سب سے مشکل ہے بہت کم لوگوں نے دیکھی، وہ یہ ہے کہ پبلک لیڈری کے موقع جن کے لیے ذاکر صاحب کے ہم چشم ہزاروں جتن کرتے تھے ان کو بے مانگے مل رہے تھے، مگر انھوں نے بے تامل چھوڑ دیے۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک تعلیم کا کام یوں بھی یک سوئی چاہتا تھا اور ان دنوں جامعہ ملّیہ کی جوئے شیر لانے کے لیے خاص طور پر اپنے آپ کو پوری طرح کھپانے اور پتّہ مار کر کام کرنے کی ضرورت تھی۔

ان دنوں ذاکر صاحب کو قریب قریب سبھی قومی ملّی لیڈروں سے سابقہ رہا، لیکن ان کی شخصیت پر قابلِ ذکر اثر صرف مہاتما گاندھی اور حکیم اجمل خاں کا پڑا، گاندھی جی کی حق بینی، حق شناسی، حق کوشی اور ہمہ گیر انسانیت کی آنچ نے اگر کچے سونے کو کندن بنایا تو حکیم اجمل خاں کے خلق و مروّت، صبر اور حلم نے اس پر جلا دی۔

بزرگانِ قوم میں سے سوا ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابو الکلام آزاد کے سب اس بے دلی کی فضا میں جو خلافت اور سوراج کی تحریک کے ناکام ہو جانے کے بعد چھا گئی تھی، اس ادارے کی کشتی کو حکومت کی مدد کے بغیر پار لگانے سے ہمّت ہار چکے تھے، ڈاکٹر ذاکر حسین نے وہ کام کر دکھایا جو انگریزی تعلیم پائے ہوئے مسلمانوں کے کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں آیا تھا۔ انھوں نے گاندھی جی کے مشورے سے جامعہ کے استادوں میں سے ان لوگوں کو ساتھ لے کر جنھوں نے بیس سال برائے نام معاوضے پر جامعہ ملّیہ کی خدمت کا عہد کیا، انجمن تعلیم ملّی کی بنا ڈالی۔ اس انجمن نے جامعہ ملّیہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور چلایا، اربابِ حکومت روڑے اٹکاتے رہے، بزرگانِ قوم (الّا ماشاء اللہ) دور سے تماشے دیکھتے رہے اور خُردانِ قوم ذاکر صاحب کی سرکردگی میں روکھی سوکھی کھا کر، موٹا جھوٹا پہن کر ایک آزاد تعلیم گاہ کی تعمیر کرتے رہے۔

۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ ذاکر صاحب کے لیے بڑی سخت آزمائش کا زمانہ تھا، یوں تو ہندوستان کے خون میں تحریکِ آزادی نے ۱۹۱۸ء سے

ہیجان پیدا کر رکھا تھا، لیکن ۱۹۳۷ء میں حکومت خود اختیاری ملنے کے بعد ہندو مسلمان اہلِ غرض کے تصادم سے فرقہ واری زہر اس شدّت سے پھیلنے لگا تھا کہ ہیجانِ خون نے زہرباد کی صورت اختیار کر لی۔ ذاکر صاحب اور ان کی جامعہ ملّیہ اس زمانے میں دوگونہ رنج و عذاب میں مبتلا تھی۔ فرقہ پرست ہندو اور مسلمان چاہتے تھے کہ دونوں کو نفرت کی آگ میں لپیٹ لیں یا جلا کر خاک کر دیں۔ قوم پرور ہندو اور مسلمان چاہتے تھے کہ دونوں کو محبّت کی زنجیروں سے سیاست کی جنگ میں گھسیٹ لیں، ذاکر صاحب کو پورا احساس تھا کہ اس وقت جب ملک کی موت اور زندگی کا فیصلہ ہونے والا تھا، سیاست سب سے اہم چیز ہے، لیکن معلّم کی روح مجاہد کی روح نہ بن سکی، دشمنوں کی عداوت اور دوستوں کی محبّت دونوں ان کو عملی سیاست میں کھینچنے میں ناکام رہے، البتہ ذاکر صاحب نے اپنی سی کوشش کی کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں مصالحت کرانے اور ملک کی تقسیم کو روکنے میں گاندھی جی کا ہاتھ بٹائیں اور انھیں آخر تک یہ آس رہی کہ اس کوشش میں کامیابی ہوگی، چنانچہ ۱۹۴۶ء میں جب معتبر ذریعوں سے معلوم ہوا کہ ذاکر صاحب کو پہلی قومی کابینہ میں رکھنے کی تجویز ہے تو انھوں نے اس امید پر کہ ایک دن کانگریس اور لیگ کی مشترک کابینہ متحد ہندوستان کا اصول مان کر بنے گی۔ اس وقت وزارت قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور یہ وہی کر سکتا تھا جو اقبال کی اصطلاح میں مردِ فقیر ہو۔ مگر ظاہر ہے ساحل پر رہ کر طوفان کو روکنے کی سعی کیا کامیاب ہوتی، فرقہ وارانہ فساد کی آگ بڑھتی ہی چلی گئی۔ ہندوستان کو تقسیم کرنا ہی پڑا، جس کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کے جسم و روح تین ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئے بھارت، مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان۔ ذاکر صاحب کے دل پر آرے چل گئے۔ ان کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہو گئی، مگر اس اندھیرے میں انھیں اپنے فرض کی راہ صاف نظر آتی رہی۔ انھوں نے پاکستان کو دعائے خیر دی اور اپنے آپ کو تن من سے ہندوستان کے حوالے کر دیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد کے تین سال ذاکر صاحب کے لیے سخت روحانی کرب اور شدید جسمانی اور دماغی محنت کے تھے۔ اس عرصے میں انھیں دلّی کے مسلمانوں کی تباہی، اضطرار، مایوسی، ہراس، دہلی میں آئے ہوئے ہندوؤں اور سکھوں کی بے سروسامانی، مصیبت، آزردگی، طیش کے جگر خراش منظر دیکھنے پڑے اور ان سب کی یکساں

خدمت کرنے والے مردوں اور عورتوں کے ساتھ اَن تھک کام کرنا پڑا، گاندھی جی کی شہادت کا جانکاہ صدمہ اٹھانا پڑا۔ جامعہ ملیہ کو اپنے معتمد ساتھیوں کے سپرد کرکے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اندر اور باہر کے بے شمار خطروں سے بچانے کی جد وجہد کرنی پڑی اور اسی زمانے میں یونیورسٹی کمیشن کے ساتھ سارے ملک کی خاک چھاننی پڑی، روح، دماغ اور جسم تینوں پر مسلسل بوجھ پڑتا رہے تو انسان کہاں تک سہہ سکتا ہے، آخر جسم کی قوتِ برداشت نے جواب دے دیا، ۱۹۴۹ء کے آخر میں شدید قلبی مرض (THROMBOSIS) کا حملہ ہوا جس سے جان کے لالے پڑ گئے۔ مگر خدا کو ذاکر صاحب سے کچھ اور کام لینا تھا، اس لیے چار پانچ مہینے صاحبِ فراش رہ کر اچھے ہو گئے۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء میں ذاکر صاحب نے اپنا سارا وقت اور توجہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی خدمت میں صرف کی اور جہاں تک ان سے ہوسکتا تھا ناامیدی میں امید، بے دلی میں ولولہ، بدنظمی میں نظم پیدا کرکے علی گڑھ کو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں بڑی اونچی جگہ پر پہنچا دیا۔

۱۹۵۲ء سے ان کی مصروفیتوں کا دائرہ بڑھ گیا۔ ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایوانِ بالا، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور اس طرح کی بے شمار عارضی اور مستقل مجلسوں کی رکنیت انجمن ترقی اردو (ہند) اور عثمانیہ یونیورسٹی کی تنظیم نو کمیٹی کی صدارت ان کے وقت کا بہت سا حصہ لے لیتی تھی۔ مگر اب بھی ان کی توجہ اور سعی کا مرکز علی گڑھ رہا اور اس کو سنوارنے اور سدھارنے میں دل وجان سے لگے رہے۔

ان گوناگوں مصروفیتوں کے بوجھ سے ذاکر صاحب کی صحت جو پہلے ہی شدید صدمے کھا چکی تھی گرنے لگی۔ ۱۹۵۶ء میں وہ علی گڑھ کی وائس چانسلری سے استعفا دے کر کچھ دن خانہ نشین رہے اور پھر سوئٹزرلینڈ اور جرمنی میں علاج کرتے رہے۔ اس عرصے میں ایک بار مولانا آزاد کی تحریک سے ذاکر صاحب کو گورنری کا منصب پیش کیا گیا تھا مگر انھوں نے انکار کر دیا تھا۔ قیامِ جرمنی کے زمانے میں انھیں پنڈت نہرو کا پیام ملا کہ میں تمھارا نام گورنری کے لیے تجویز کر رہا ہوں دیکھو انکار نہ کرنا ورنہ مجھے ملال ہوگا۔ چنانچہ ۱۹۵۷ء کے وسط میں ذاکر صاحب بمصداق "می برد ہر جا کہ خاطرِ خواہ

اوست ۱۹۵۷ء بہار کے گورنر ہو کر پٹنہ پہنچ گئے۔ گورنری کے پانچ سال ذاکر صاحب کی صحت کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے۔ یہاں ضبط اوقات، کام کے وقت کام اور آرام کے وقت آرام جس کے ذاکر صاحب قول اور عمل سے ہمیشہ منکر رہے مجبوراً کرنا پڑا۔ دستور و روایات کی کڑی زنجیروں کا توڑنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ یہاں ان کا کام زیادہ تر یہ تھا کہ سیاسی کشمکش اور دارو گیر کی آگ کو چھینٹے دیتے رہیں کہ زیادہ بھڑکنے نہ پائے۔ اس خدمت کو ذاکر صاحب نے اس قدر خوبی سے انجام دیا کہ ۱۹۶۲ء میں وہ جمہوریۂ ہند کے نائب صدر اور پارلیمنٹ کے ایوانِ بالا کے میر مجلس مقرر ہوئے۔ اس پانچ برس میں ذاکر صاحب اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے علاوہ اکثر امن و محبت کے سفیر کی حیثیت سے بیرونی ممالک کے دورے کئے ہیں۔ اس میدان میں ان کے جوہر ایسے کھلے کہ سوا ان لوگوں کے جن کی آنکھوں پر تعصب یا حسد نے پردہ ڈال رکھا ہے ہر شخص کو نظر آگیا کہ پنڈت نہرو کے بعد ڈاکٹر رادھا کرشنن کے علاوہ اگر کوئی اس میدان کا مرد ہے تو وہ ذاکر صاحب ہیں۔

ذاکر صاحب کی شخصیت کی نشو و نما کا ایک سرسری سا خاکہ کھینچنے کے بعد اب ہم اس میں کچھ تھوڑا سا رنگ بھرتے ہیں، تاکہ اس قلمی تصویر کے نقش کسی حد تک اُبھر آئیں۔

میرے محترم اُستاد پروفیسر اشپرانگر نے انسانی شخصیتوں کی چھ بنیادی قسمیں قرار دی ہیں۔ مذہبی، سماجی، علمی، جمالی، سیاسی، معاشی۔ ذاکر صاحب کی شخصیت ان میں سے دوسری قسم سے تعلق رکھتی ہے، یعنی گو اس میں مذہب و تصوف، فکر و نظر اور ذوقِ جمال کا خاصا گہرا رنگ ہے اور اقتصاد و سیاست کا کچھ ہلکا سا رنگ موجود ہے، لیکن ساری زمین انسان دوستی سے رچی ہوئی ہے۔ ان کے لیے انسان سے خواہ فرد کی شکل میں ہو یا جماعت کی شکل میں، محبت اور اس کی خدمت کرنا نہ کوئی مذہبی یا اخلاقی فرض ہے، جس کے لیے شعوری عقیدے اور ارادے کی، نہ کوئی علمی اصول ہے، جس کے لیے فکر کی اور نہ کوئی سیاسی تدبیر ہے، جس کے لیے تدبّر کی ضرورت ہو، بلکہ وہ تو ان کی فطرت کا قانون ہے جو بلا شعور بلا ارادہ کام کرتا ہے، ہم سنا کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے دوستوں، عزیزوں یا عام طور پر بندگانِ خدا کی خدمت کا بیڑا

اٹھایا ہے، فلاں نے قوم و ملت کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیا ہے، دنیا کو تج دیا ہے، ایثار کیا ہے، قربانی کی ہے۔ ذاکر صاحب کو میں نے پچھلے ۴۴ سال میں ہمیشہ افراد اور جماعتوں کی بھلائی کی کوشش میں محو دیکھا ہے، لیکن میرے علم و یقین میں نہ انھیں کبھی خدمت کا بیڑا اٹھانے کا احساس ہوا، نہ اپنے آپ کو وقف کرنے کا، نہ تیاگ کا، نہ ایثار و قربانی کا۔ احساس ہوا تو صرف یہ کہ زندگی کا دھارا خود بخود بے تکلف بے رکاوٹ ایک سمت بہہ رہا ہے اور انھوں نے کہا اچھا ہے بہنے دو۔ سماجی یا انسانی دوست ٹائپ کی ایک اور بڑی پہچان ہے اور وہ بھی ذاکر صاحب میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان میں "خودی" اور "بے خودی" اس طرح گھل مل کر شیر و شکر ہو گئی ہے کہ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں خواہ کسی ملک، کسی مذہب، کسی طبقے کے ہوں، انھیں احساسِ کمتری اور اظہارِ برتری کی کشمکش سے گزرنا، خود فروشی اور خود فراموشی کے بیچ میں جھولنا نہیں پڑتا، نئے آدمی سے وہ اس طرح کھلے آغوش اور کھلے دل سے ملتے ہیں جیسے برسوں کا دوست ہو۔ وہ انسان کو کتاب سمجھ کر اس کی تنقید، تحلیل اور تجزیہ نہیں کرتے کہ کسی جزو کو رد، اور کسی کو قبول کریں۔ بلکہ جیسا ہے سارے کا سارا لے لیتے ہیں اور اپنے کو تمام و کمال اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اخلاقی رہنما ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں اور ہمارے زمانے میں گاندھی جی نے اس پر بہت زور دیا ہے کہ بُرے آدمی اور اس کی بڑائی میں فرق کرو، اس طرح جیسے بیمار اور بیماری میں کرتے ہو۔ برائی کو ضرور برا کہو اور دفع کرنے کی کوشش کرو۔ مگر اس انسان کو جس کے اندر برائی نظر آئے بیمار کی طرح ہمدردی کے قابل، علاج کا محتاج، محبت کا سزاوار سمجھو، اس اصول پر اپنی طبیعت کے تقاضے سے عمل کرتے ہوئے میں نے کسی کو دیکھا ہے تو ذاکر صاحب کو، برے اعمال کی وجہ سے کسی کو برا سمجھنا تو درکنار، ذاکر صاحب کی انتہا مروت اکثر انسان کے جوہر انسانیت کی خاطر اس کے برے اعمال کو قبول نہیں تو گوارا تو ضرور کر لیتی ہے، کسی کے دل کو ہاتھ میں لینا ان کی طریقت میں حج اکبر ہے اور کسی کے دل کو توڑنا گناہِ کبیرہ بلکہ کفر ہے، ان کی طبیعت حوصلہ مند ہے اور قومی اعزاز، اجتماعی منصب بے مانگے ملے تو ان کا دل قبول کرنے کو چاہتا ہے، لیکن اگر اس میں کسی حریف کا مقابلہ کر کے اس کو شکست دینا ہو، کسی انسان کو روند کر آگے بڑھنا ہو تو وہ عموماً پیچھے

ہٹ جاتے ہیں۔ جب ذاکر صاحب تعلیم کے لیے برلن پہنچے تو وہاں کے ہندوستانیوں کی قومی انجمن ہندوستان ایسوسی ایشن کے عہدہ داروں کا انتخاب در پیش تھا، ذاکر صاحب کی شخصیت نے چند ہی روز میں اتنا گہرا اثر ڈال دیا تھا کہ بہت بڑی اکثریت ان کو صدر منتخب کرنا چاہتی تھی، لیکن ذاکر صاحب اپنے حریف کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ دوسرے سال جب لوگ انھیں اچھی طرح جان گئے تھے اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتا تھا کہ وہ ان کا حریف بنے، بلا مقابلہ وہ صدر منتخب ہوئے۔

انسان دوستی کے بعد سب سے گہرا رنگ ذاکر صاحب کی شخصیت میں خدا پرستی کا ہے، ان کی دین داری دنیا داری کے پردے میں سے یوں بھی تھوڑی بہت جھلکتی رہتی ہے، لیکن اچھی طرح چمکتی اس وقت ہے جب آس پاس کی فضا میں مایوسی کا اندھیرا چھا جاتا ہے، ان کے ایمان کی ثابت قدمی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب اچھے اچھوں کے ایمان ڈانواڈول ہو جاتے ہیں۔ اس کی سب سے روشن مثال وہ ہے جب ستمبر ۱۹۴۷ء میں دہلی میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تھا۔ جامعہ ملیہ کے کارکنوں کی جان ہر وقت خطرے میں تھی، اس کے بہت سے سچے ہمدرد جو اہل الرّائے سمجھے جاتے تھے، اصرار کر رہے تھے کہ کچھ دن کے لیے دہلی چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ، لیکن ذاکر صاحب کے قدم جمے رہے اور ان کی وجہ سے ہزاروں اُکھڑے ہوئے قدم پھر جم گئے۔ جسمانی اور روحانی ہلاکت کے سیلاب میں ذاکر صاحب نے نہ خود اپنا لنگر سنبھالے رکھا بلکہ بہت سے ڈوبنے والوں کو یہاں تک کہ ان لوگوں کو جو خود ان کو ڈبونا چاہتے تھے سہارا دے کر کنارے پر پہنچا دیا۔ ان دنوں ذاکر صاحب نے ایک دوست کو لکھا تھا کہ مجھے انسان کی انسانیت پر بھروسہ ہے، جنون کی یہ لہر دیکھتے دیکھتے گزر جائے گی۔ ظاہر ہے انسان کی انسانیت پر ایسا بھروسہ وہی کر سکتا ہے جو خدا کی خدائی پر اٹل ایمان رکھتا ہو۔

نفاستِ ذوق اور لطافتِ احساس وہ صفات ہیں جو ذاکر صاحب کی شخصیت کی گہرائی سے ناسازگار ماحول کے باوجود اُبھر کر رہیں۔ مولوی بشیر الدین کے اٹاوے اور ضیاء الدین کے علی گڑھ میں رہ کر شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ کا ذوق رکھنا روزمرہ کی زندگی میں، رہن سہن اور اخلاق و آداب میں، بیرونی صفائی اور ستھرائی اندرونی

پاکیزگی اور حسن و تناسب کا لحاظ رکھنا بہت دشوار تھا، مگر ذاکر صاحب نے کر دکھایا۔
جامعہ ملیہ کے دور تنگدستی ہی میں ذاکر صاحب نے اپنے گھر اور اپنے ادارے کو سادگی اور سلیقے کا نمونہ بنا دیا تھا۔ پھر علی گڑھ میں جہاں انھیں مقابلتاً فراغت حاصل تھی، ان کی ذاتی توجہ اور اہتمام کی بدولت وائس چانسلری کے بنگلے سے لے کر یونیورسٹی کی آخری حدود تک ساری بستی گلزار نظر آنے لگی۔ سڑکوں، نالیوں، چہ بچوں کی صفائی سے صحتِ جسم و صحتِ دماغ دونوں کی سطح اونچی ہو گئی۔ ۔ ۔ علی گڑھ کی بے ہنگم اور بدنما عمارتیں ذاکر صاحب کی آنکھوں میں طالب علمی کے زمانے سے کھٹکتی تھیں، مگر ظاہر ہے انھیں ایک دم سے گرا کر بدل نہیں سکتے تھے اب جہاں تک وسائل میسّر آئے، نئی عمارتیں اپنے ذوق کے مطابق بنوائیں۔
موسیقی اور مصوری میں ذاکر صاحب خاصا وسیع ذوق رکھتے ہیں اور مشرقی اور مغربی فن کاروں کے کمال سے یکساں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کے پاس منتخب تصویروں اور ریکارڈوں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ہے، جس میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا رہتا ہے، خطاطی کا فن بھی ان کا پسندیدہ فن ہے اور ایک زمانے میں ان کے پاس کتبوں کا بہت اچھا ذخیرہ تھا، جس کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ شعر میں ان کی دلچسپی کا دائرہ اردو، فارسی، انگریزی جرمن شاعری کو محیط کیے ہوئے ہے، مگر سب سے زیادہ حظ وہ فارسی شاعری سے خصوصاً اقبال کے فارسی کلام سے اٹھاتے ہیں۔ ذاکر صاحب کو جھوم جھوم کر دل کش لحن میں اقبال کے شعر پڑھتے سنیئے تو آپ کو یاد آجائے گا کہ اقبال، مفکر، معلم، مصلح ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔
علمی مشاغل میں ذاکر صاحب کو سب سے زیادہ پڑھنا، اس سے کم پڑھانا اور اس سے کم لکھنا مرغوب ہے، کتب بینی کا ان کو اتنا گہرا اور سچا شوق ہے کہ انتہائی مصروفیت پریشانی یہاں تک کہ علالت کی حالت میں بھی اس کا تھوڑا بہت سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ باقاعدہ تحصیل انھوں نے علمِ معاشیات کی کی تھی اور آگے چل کر فنِ تعلیم کو اپنا بنایا، لیکن ان کا مطالعہ ان دونوں کے علاوہ اور دنیا بھر کے موضوعات پر بھی حاوی ہے، البتہ قصے کہانیاں جن کا شوق اس زمانے میں لوگوں کو خبط کی حد تک پہنچ گیا ہے، ذاکر صاحب کم پڑھتے ہیں، درس و تدریس کا کام جب تک انھوں نے

خاصی دل چسپی سے کیا، لیکن باقاعدہ درس سے زیادہ ان کو اس کی لگن تھی اور اب بھی ہے کہ طلبار کے دل میں عام مطالعے کا، اپنی اپج سے پڑھنے اور لکھنے کا شوق پیدا کریں۔ علی گڑھ ہی پر موقوف نہیں کسی یونیورسٹی کا کوئی نوجوان طالب علم یا استاد جو زر و منصب کی طلب اور پارٹی بازی کی لت سے محفوظ رہ کر خلوص سے علمی کام کرنا چاہتا ہے، ذاکر صاحب کو دل سے عزیز ہوتا ہے اور وہ اس کی بقدر امکان بھرپوری مدد کرتے ہیں۔

ذاکر صاحب اردو، انگریزی تقریر و تحریر پر پوری قدرت رکھتے ہیں، ان کی تقریر سادگی اور پُرکاری میں ان کی شخصیت کی بولتی ہوئی تصویر اور ان کی تحریر اگر یکسوئی سے لکھی ہوئی ہو، بے ساختہ پن، جوش اور خلوص میں ان کی سیرت کا آئینہ ہوتی ہے، لیکن ہندوستان کی علمی اور تعلیمی دنیا کو ذاکر صاحب سے یہ شکایت ہے کہ وہ بہت کم بولتے اور لکھتے ہیں، تقریر سے بچنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ قلب کی بیماری کا دورہ پڑنے کے بعد ڈاکٹروں نے ذاکر صاحب کو زیادہ تقریر کرنے سے منع کر دیا ہے، شاید اس وجہ سے کہ وہ اس میں دل کی طاقت بہت کھپاتے ہیں۔ اب رہی تحریر سو اس کے لیے آج کل تو انھیں جتنی فرصت چاہیے وہ نصیب نہیں، لیکن در اصل یہ ان کی پرانی کمزوری ہے کہ لکھنے کے کام کو برابر ٹالتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ یا تو وہ بالکل ہی ٹل جاتا ہے یا عین وقت پر رات بھر جاگ کر پورا کیا جاتا ہے۔

لوگوں کو مشکل سے یقین آئے گا کہ بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں ہندوستان میں زندگی گزارنے اور جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی جیسی قومی اور ملی تعلیم گاہوں کے وائس چانسلر رہنے کے بعد ذاکر صاحب سیاست سے بالکل بے تعلق رہے۔ سیاسی لیڈر بننے کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہے، ان میں سے اکثر ذاکر صاحب میں بڑے بڑے لیڈروں سے زیادہ موجود ہیں —— مردم شناسی، موقع شناسی، مصلحت بینی، شخصیت کی کشش، زبان کی طاقت، جلد فیصلہ کرنے کی قوت، مگر ایک تو معلمی کی غالب صلاحیت نے انھیں اس طرح باندھ کر جکڑ لیا کہ کسی اور صلاحیت کے آزمانے کا موقع ہی نہیں دیا، دوسرے اور سب صفات کے باوجود ان میں ایک صفت یعنی سخت دلی کی اس حد تک کمی ہے کہ سیاسی لیڈری کے میدان میں ان کا

کامیاب ہونا بہت مشکل ہے، جس کا دل دوسروں کو گراتے ہوئے دکھتا ہو وہ اس اکھاڑے میں ہر ایک سے چت ہو سکتا ہے۔

سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اقتصادیات اور معاشیات میں مہارت حاصل کرنے کے باوجود اقتصاد و معیشت ذاکر صاحب کا سب سے کمزور پہلو ہے، جہاں تک ان کا بس چلتا ہے وہ کوئی کام پہلے سے پورا منصوبہ بنا کر نہیں کرتے، اس لیے اکثر انھیں بے جا زحمت اور زیر باری اٹھانی پڑتی ہے۔ ضبط و نظم کی کمی نے ان کی کارکردگی کو جتنی ہو سکتی تھی، اس سے کم کر دیا ہے۔ ان کا معاشی قانون یہ ہے کہ طلب کو رسد کا پابند نہیں بلکہ رسد کو طلب کا پابند بناؤ۔ چادر دیکھ کر پاؤں نہ پھیلاؤ، بلکہ پاؤں دیکھ کر چادر بناؤ۔ یہ بات اصولاً بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے، لیکن اس پر عمل کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں، جہاں تک قومی کاموں مثلاً جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی کا تعلق ہے ذاکر صاحب کا یہ اصول کہ وہ خرچ ضرورت یا حوصلے کے مطابق بڑھاتے چلے جائیں اور آمدنی خرچ کے مطابق بڑھنے کی امید رکھیں، عموماً کامیاب رہا، اس لیے کہ قوم اور حکومت کو ان کی جرأتِ رندانہ کی لاج رکھنی پڑی، لیکن نجی زندگی میں انھیں بے اندازہ خرچ کرنے سے نہ صرف عسرت کے زمانے میں سخت دقتیں اٹھانی پڑیں بلکہ اب یک گونہ فراغت کے زمانے میں بھی اٹھانی پڑتی ہیں۔ اس لیے کہ جس نسبت سے آمدنی بڑھی اسی نسبت سے جا و بے جا خرچ خصوصاً داد و دہش بھی بڑھتی چلی گئی۔

ہم نے دیکھا کہ ذاکر صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ مگر ان میں مرکزی اور بنیادی حیثیت انسان دوستی کو حاصل ہے۔ انسان دوست شخصیت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک مرشد و معلّم کی دوسرے مصلح و مجاہد کی۔ مرشد و معلّم کی توجہ کا موضوع انسان بحیثیت فرد کے ہے، وہ ارشاد و ہدایت تعلیم و تربیت کے ذریعے افراد کے اندر ان قدروں کو پیدا کرتا ہے جو اسے انسانیت کے بلند منصب کے سزاوار بنائیں۔ مصلح و مجاہد کا کام انسانی جماعت یا سماج کا سدھار کرنا ہے یعنی ان خرابیوں سے جو سماج میں پیدا ہو گئی ہیں، لڑنا اور ان کو دور کرنا، تاکہ انسانیت کی دبی ہوئی روندی ہوئی قدریں ابھر آئیں، چمک اٹھیں۔ دونوں قسم کے انسان دوستوں کی

زندگی کا قانون محبت ہے، لیکن ایک کے ہاں محبت جمالی شان دکھاتی ہے، دوسرے کے ہاں جلالی۔ کبھی کبھی یہ دونوں شانیں ایک ہی شخصیت میں جمع ہو جاتی ہیں اور وہ پیمبر یا مجدد کی شخصیت بن جاتی ہے۔

ذاکر صاحب کی انسان دوستی اب تک مرشد و معلم کی شان رکھتی ہے، وہ انسان کو فرد کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، اس کی روح سے محبت رکھتے ہیں اور اسے تعلیم و ہدایت کے ذریعے سنوارنا چاہتے ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں اچھے مسلمان پیدا کرو، اچھی اسلامی جماعت پیدا ہو جائے گی، اچھے ہندوستانی بناؤ اچھا ہندوستان بن جائے گا، لیکن وہ اس بات کو نظرانداز کر دیتے ہیں کہ معلم کا مدرسہ ہو یا مرشد کی خانقاہ، دونوں کا اثر فرد کی تعلیم و ہدایت میں محدود ہے، دوسرے اجتماعی ادارے، خاندان، طبقہ، قوم، مذہب، رسم و رواج اگر الگ الگ نہیں تو مل کر انسانی شخصیت کی تشکیل میں کہیں زیادہ اثرانداز ہوتے ہیں۔ اگر ان اجتماعی سانچوں میں سے اکثر خراب ہو گئے ہیں، اگر آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہو تو معلم اور مرشد کی ساری سعی رائگاں جاتی ہے، جب تک کوئی مصلح اور مجاہد اجتماعی سانچوں کو نہ سدھارے یا ان کو توڑ کر نئے سانچے نہ بنائے اور جو ایک ہی شخص میں معلم اور مرشد کے ساتھ مصلح اور مجاہد یعنی مجموعی طور پر مجدد کی شان پیدا ہو جائے تو پھر کیا کہنا۔

شاید ذاکر صاحب جیسے صوفی منش کو یہ توڑ پھوڑ قانونِ وحدت اور آئینِ محبت کے خلاف نظر آئے، لیکن اس مشکل کو ایک مردِ عارف نے حل کر دیا ہے، جس نے کہا ہے ؎

نقشِ حق را ہم ز امرِ حق شکن
بر زجاجِ دوست سنگِ دوست زن

اور ایک مردِ عمل نے ثابت کر دیا کہ پرانے سانچے خواہ سنگِ خارا کے بنے ہوئے ہوں بے تیشہ دگر ز محض تمسک بالحق صرف "ستیہ گرہ" سے توڑے جا سکتے ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب پر سب سے زیادہ جناب پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب نے لکھا ہے اور ان کو اس کا حق بھی پہنچتا ہے، موصوف نہ صرف ذاکر صاحب کے ساتھیوں میں سے ہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ ان کے "یارِ غار" ہیں۔

رشید صاحب کا ذاکر صاحب سے بڑا گہرا اور طویل تعلق ہے اور وہ صحیح معنی میں جلوت و خلوت کے رازداں ہیں، اس لیے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، محض سنی سنائی یا ظن و قیاس کی باتیں نہیں ہیں، عینی مشاہدے اور ذاتی تجربے پر مبنی ہیں۔

رشید صاحب نے ذاکر صاحب پر ایک چھوٹی سی کتاب لکھی تھی جو کافی مقبول ہوئی، یہ مضمون جو اگلے صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے، اس کے علاوہ ہے۔ یہ "مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ" کے ذاکر نمبر (بابت ۲۴ فروری ۱۹۵۲ء) میں شائع ہوا تھا۔ اگرچہ اس مضمون میں رشید صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ذاکر صاحب کی سیرت اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، مگر چونکہ یہ مضمون اس وقت لکھا گیا تھا جب ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور اس میں اس زمانے کے بعض واقعات کا ذکر بھی آگیا ہے۔ اس لیے میں نے اصل عنوان جو "یادِ یارِ مہرباں آید ہمی" تھا، بدل کر وہ رکھا جو اگلے صفحے پر آپ ملاحظہ کریں گے۔

ذاکر صاحب

مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے زمانے میں

کسی شخص کو مشکل سے یقین آئے گا کہ ذاکر صاحب اکثر تندرستی سے زیادہ علالت کے زمانے میں لکھنے پڑھنے کا کام اور کھانے پینے کا انصرام کرتے ہیں۔ ملنے جائیے تو آپ کا سابقہ دونوں سے ہوگا، یعنی موصوف نے کیا پڑھا ہے اور آپ کو کیا کھانا ہے۔ یہاں تک غنیمت ہے مشکل اس وقت آن پڑتی ہے جب وہ کھانے کے دوران یہ بھی پوچھ لیتے ہیں کہ آپ نے کیا پڑھا ہے۔ ذاکر صاحب کو دھوکا دینا مشکل ہے، اس لیے کہ اوّل تو جی نہیں چاہتا کہ ان کو دھوکا دیا جائے۔ ایسا کرنے میں قباحت یہ ہے کہ وہ دھوکے میں آتے نہیں، لیکن آپ اس دھوکے میں رہتے ہیں کہ وہ آگئے۔ آپ ان سے جو کام لینا چاہیں وہ دھوکا دیئے بغیر زیادہ آسانی سے لے سکتے ہیں۔ چنانچہ کوئی شخص کج نہاد نہیں تو احمق ضرور ہے اگر وہ ذاکر صاحب کو دھوکا دینے کے دردِ سر میں مبتلا ہونا چاہتا ہے۔

کھانے اور بات چیت سے فارغ ہو کر آپ رخصت ہوتے ہیں تو کبھی کبھی کچھ اس طرح کا احساس ساتھ لے جاتے ہیں کہ کھانا پینا تو ٹھیک رہا، گفتگو ذرا ٹھیک نہ رہی۔ چنانچہ ایسے لوگ جو اپنے کام میں کم بصیرت رکھتے ہیں یا دل نہیں لگاتے، ذاکر صاحب سے ملنے کا ارادہ بھی کم ہی کرتے ہیں۔

غیر معلوم اور غیر معمولی ذہنی و روحانی صلاحیتیں بر سرِ کار آجاتی ہیں۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ ذاکر صاحب کو ذاکر صاحب بنانے میں ان دشواریوں کا بڑا دخل ہے، جن میں انھوں نے اب تک کام کیا ہے۔ ذاکر صاحب میں فطرت کی طرف سے امید اور حوصلے کی استعداد غیر معمولی لوگوں سے بھی کچھ زیادہ ہی ارزانی ہوئی ہے۔ دوسروں کو امید اور حوصلہ دلانا ہوتا ہے تو ان میں یہ صلاحیت اور زیادہ توانا ہو جاتی ہے۔

چند دنوں کی بات ہے رفقائے شعبہ کے ذہن میں "علی گڑھ ہسٹری آف اردو لٹریچر" کی تالیف کا خیال آیا۔ چنانچہ ایک اسکیم کا خاکہ تیار کر کے ذاکر صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا اور جیسا کہ موصوف کا "اسٹائل" ہے، کچھ مجھ پر کچھ اسکیم پر کچھ بیماری میں علاج اور کھانے پینے کی احتیاط پر جرح و تنقید شروع کر دی۔ میں بھی بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہوا کیے! آخر میں وہی ہوا جو پہلے سے جانتا تھا۔ ذاکر صاحب نے ہم سے بڑھ کر اسکیم کا خیر مقدم کیا اور فرمایا، اہتمام شروع کر دیجیے، اخراجات کا انتظام ہو جائے گا۔ چنانچہ حکومت نے اسکیم منظور کر لی اور سارے مراحل طے پا گئے۔

یہ تو ایک معمولی سی مثال تھی۔ ورنہ ذاکر صاحب کے عہد میں اس طرح نیز دوسری نوعیتوں کے توسیعی اور تعمیری منصوبے مختلف شعبوں اور محکموں سے مسلسل آتے رہتے۔ موصوف اپنا تھوڑا سا بھی اطمینان کر لینے کے بعد اور کبھی کبھی محرک کی ہمت افزائی کی خاطر مجوزہ منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی منظوری دے دیتے۔ کام یہاں پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتا تھا بلکہ مجوز سے زیادہ موصوف اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لیے سرگرم سعی ہو جاتے۔

ذاکر صاحب نے کسی شعبہ یا محکمہ کی اصلاحی یا توسیعی اسکیم کو مسترد نہیں کیا، خواہ وہ معمولی اخراجات پر مشتمل ہوتی خواہ کثیر پر۔ یہی اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس اسکیم کو کامیاب بنانے کی کوشش اس شوق اور حوصلے سے کرتے جیسے اس اسکیم کے مصنف اور کارپرداز بھی خود تھے۔ ہم میں سے کسی کی کوئی کتاب 'زیورِ طبع سے آراستہ' نہ ہو پاتی

میں خیر مقدم کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کے خلاف جھوٹی خبریں بھیجنے اور پھیلانے والوں کو ڈانٹا تھا اور کس سچائی سے، کیسے وقار سے، کتنے کھرے الفاظ اور نڈر لب و لہجہ میں یونیورسٹی کی پوزیشن واضح کی تھی۔ ذاکر صاحب پر وہ جلال، ہماشمے وتو بابھاوے کی پر تقدس و تمکین موجودگی، ہال کے چپے چپے کے طلباء و اسٹاف اور شہر کے اکابر سے بھرا ہونا، موقع اور زمانے کی نزاکت، مجمع پر سکوت کی ایک پراسرار گرفت، مختصر یہ کہ گذشتہ ۳۵، ۳۶ سال میں اسٹریچی ہال میں ایسی میٹنگ کم سے کم میری نظر سے نہ گزری تھی۔

اس تقریر کے بعد پھر جب تک ذاکر صاحب نے یونیورسٹی سے اپنی علیحدگی کا اعلان نہیں کر دیا، اشرار و انفار کے زبان و قلم کے فتنوں سے ہم اور ہماری یونیورسٹی نہ صرف محفوظ رہی بلکہ ہر جگہ اور ہر موقع پر یونیورسٹی، اسٹاف اور طلباء کے بارے میں تحسین و تہنیت ہی کے کلمے سننے گئے۔ ذاکر صاحب کے اس احسان، خدمت یا کارنامے کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو اس ادارے کی ناکسی و نامرادی کے وہ دن دیکھ چکے ہیں جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔

ذاکر صاحب کے وائس چانسلر ہونے سے پہلے اپنا کچھ ایسا حال تھا کہ ملک یا ملک سے باہر کوئی مشہور شخص یا اپنے فن یا مسلک کا کامل آجاتا تو یہ فکر دامن گیر ہوتی کہ مہمان کی رفاقت یا راہ نمائی کے لیے کس شخص کا انتخاب کیا جائے تاکہ ہمارا بھرم قائم رہے اور مہمان خوش و مطمئن اور اس ادارے کی خوبیوں کا معترف ہو کر رخصت ہو۔ بات یہ ہے کہ کتنے دنوں سے اپنی یونیورسٹی کو یونیورسٹی کے درجے سے گرتے اور طرح طرح کی فضیحتوں سے دوچار ہوتے دیکھ چکا تھا کہ آپ اپنی نظر میں سبک ہو چلا تھا اور کچھ اس طرح کا احساس ہونے لگا تھا کہ اپنی روایات، اپنی قوم، اپنی یونیورسٹی یہاں تک کہ اپنے بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں کے بارے میں محبت اور عظمت کی جو رائے رکھتا تھا وہ شاید ایک خود فریبی تھی جس نے میرے احساسات کے احترام میں خوش عقیدگی کا جامہ پہن لیا تھا۔

طوفان و تہلکہ ہے جو باوجود کوشش کے میرے "تخمینِ وطن" کے خس و خاشاک کے
قابو میں کچھ نہ آیا اور کیوں آئے جب دریا بوجود خویش موجے دارد! ذاکر صاحب نے
اس طرح کے مصوّری کے نادر اور نمایندہ نمونے جمع کیے ہیں جن میں سے دو ایک دیوار
پہ آویزاں تھے۔ کبھی کبھی میری نگاہ ان پر جا پڑی اور ذاکر صاحب کی مجھ پر تو ایک
لمحہ کے لیے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ہم تینوں یعنی ذاکر صاحب، میرے اور تصویر کے
ایک جیسے ہو گئے ہوں۔

آکسپریشن (IMPRESSIONS)

جدید مصوّری اور میرے درمیان اس طرح کی جو دیرینہ بدگمانی چلی آتی تھی اس کا
احساس کرکے ذاکر صاحب نے ایک مشہور اور مستند مصنّف کی کتاب مطالعہ کے لیے
مرحمت فرمائی، اس بشارت کے ساتھ کہ اس کے مطالعے کے بعد جدید مصوّری کے
پرکھنے اور پسند کرنے میں سہولت ہوگی۔ کتاب پڑھ کر واپس کی تو میرے تاثرات
دریافت کیے۔ میں نے عرض کیا کہ اس کتاب کے مصنّف پر میرے کچھ "اخلاقی" اعتراضات
ہیں۔ اوّل تو معلوم نہیں کیوں اور کیسے اسے میری طرف سے سوءِ ظن ہے کہ میں اس کی
باتوں پر دھیان نہ دوں گا، اس لیے اچھی خاصی سمجھ میں آنے والی بات بھی ڈانٹ
ڈانٹ کر سمجھاتا ہے۔ جیسے کچھ اس طرح کا مطلب ہو کہ نہ سمجھوں تو بھاڑ میں جاؤں۔
دوسرے یہ کہ اس نے آرٹ کے بڑے نازک، بلیغ نکتے واضح کیے ہیں،
جن کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن ثبوت یا مثال میں جب وہ انھیں "شاہکاروں"
کا حوالہ دیتا ہے جن سے میں "رنج ہوں"، یا جن پر وہ نکتے مرکوز ہیں جن میں سے
چند آپ کی ملکیت میں ہیں تو میں جہاں کا تہاں رہ جاتا ہوں۔ میں جسے "بنائے
مخاصمت" بتاؤں مصنّف اپنے لیے اس کو "سندِ جواز" قرار دے تو انصاف کیجیے
"مردناداں" کدھر جائے، جس کی نہ بھر تری ہری سنتے ہیں نہ ڈاکٹر اقبال۔
ذاکر صاحب کے چہرے پر شکن نہ پاکر میں نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا اور
عرض کیا، ذاکر صاحب آپ مجھ سے بدگمان نہ ہوں، یہ طرح طرح کے ہیولے سر آنکھوں
پر، لیکن یہ آرٹ کا نمونہ نہیں ہیں بلکہ ہمارے حیوانی یا شہوانی مطالبات یا میلانات
کی سائنٹفک تصویریں یا تعبیریں ہیں، جن کا جمالیات سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے
بعد گفتگو کا دروازہ بند ہو گیا اور تصاویر زہر خند فرماتی رہیں۔

ایک بار معالج نے مرض کی طرف سے بہت کچھ "ڈرا دھمکا کر" کئی ہفتے مسلسل آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ اس مشورے پر عمل اس طرح کیا گیا کہ موصوف نے تصوّف پر فارسی، اردو کی کوئی درجن بھر ضخیم کرم خوردہ کتابیں جو بادامی سے زیادہ بادامی اور بودے کاغذ پر نولکشور پریس کے شاید ابتدائی دور میں شائع ہوئی تھیں اور کسی بڑے ہی اناڑی دفتری نے ان کی جلد باندھی تھی، یونیورسٹی لائبریری سے منگا کر رات کے تین بجے تک پڑھ کر ختم کر دیں۔ ساتھ ہی ساتھ فرصت کے اوقات میں کافی تیار کرنے کی جتنی ترکیبیں اِدھر اُدھر سُنی یا کتابوں میں پڑھی تھیں، ان کو اپنے سامنے تیار کراتے رہے اور ان پر عبور پانے کے بعد اس مہم میں جتنے تیاردار شریک تھے، ان کو بڑے اہتمام سے کافی "بہ نسخہائے نو بہ نو" اور اس سے متعلق اور غیر متعلق جو "مقویات" ہوتی ہیں، وہ سب پلاتے کھلاتے رہے۔ بیچ بیچ میں شرکاءِ مجلس کے ذہن و ظرف اور موقع و محل کے اعتبار سے تصوّف اور صوفیوں کے اسرار و رموز بھی واضح کرتے رہے۔

ذاکر صاحب کو کن باتوں سے دل چسپی ہے، اس کا پتہ لگانا آسان ہے۔ اس لیے کہ ان کو ہر چیز سے دلچسپی ہے۔ کم لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں جو اپنے گردو پیش اور نزدیک و دور کی ہر طرح کی معمولی و غیر معمولی چیزوں اور باتوں سے اتنی بھرپور دلچسپی رکھتے ہیں جتنی کہ وہ۔ ان کی یہ صلاحیت ان کی سیرت و شخصیت کے بہت سے اہم دلکش پہلوؤں کو بے نقاب کرتی ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ کسی حال میں امید و اخلاص کا دامن نہ خود چھوڑتے ہیں نہ دوسرے کو چھوڑنے دیتے ہیں۔

اشیاء اور واقعات سے بچوّں کا سا شوق اور تجسّس ذہین اور عالی ظرف افراد میں بڑے دور رس نتائج کا باعث بن جاتا ہے۔ یہ بات یا اس طرح کی باتیں کسی معمولی آدمی کے حصّے میں آجائیں تو وہ کہیں کا نہ رہے، لیکن ذاکر صاحب کا ذہن اتنا ہمہ گیر اور ان کا ذوق اتنا رچا ہوا ہے کہ وہ فطرت کی اس گراں بہا استعداد سے پورے طور پر فائدہ اٹھاتے ہیں اور فائدہ پہنچاتے ہیں۔

ذاکر صاحب کو تمام عمر دشواریوں میں کام کرنا اور دشواریوں ہی سے کام لینا پڑا۔ اچھے اور بڑے کام کی مشکلات اٹھانے اور اٹھاتے رہنے سے انسان کی بعض

غیر معلوم اور غیر معمولی ذہنی و روحانی صلاحیتیں برسرِ کار آجاتی ہیں۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ ذاکر صاحب کو ذاکر صاحب بنانے میں ان دشواریوں کا بڑا دخل ہے، جن میں انھوں نے اب تک کام کیا ہے۔ ذاکر صاحب میں فطرت کی طرف سے امید اور حوصلے کی استعداد غیر معمولی لوگوں سے بھی کچھ زیادہ ہی ارزانی ہوئی ہے۔ دوسروں کو امید اور حوصلہ دلانا ہوتا ہے تو ان میں یہ صلاحیت اور زیادہ توانا ہو جاتی ہے۔

چند دنوں کی بات ہے رفقائے شعبہ کے ذہن میں 'علی گڑھ ہسٹری آف اردو لٹریچر' کی تالیف کا خیال آیا۔ چنانچہ ایک اسکیم کا خاکہ تیار کرکے ذاکر صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا اور جیسا کہ موصوف کا "اسٹائل" ہے، کچھ مجھ پر کچھ اسکیم پر کچھ بیماری میں علاج اور کھانے پینے کی احتیاط پر جرح و تنقید شروع کر دی۔ میں بھی بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہوا کیے! آخر میں وہی ہوا جو پہلے سے جانتا تھا۔ ذاکر صاحب نے ہم سے بڑھ کر اسکیم کا خیر مقدم کیا اور فرمایا' اہتمام شروع کر دیجیے' اخراجات کا انتظام ہو جائے گا۔ چنانچہ حکومت نے اسکیم منظور کر لی اور سارے مراحل طے پا گئے۔

یہ تو ایک معمولی سی مثال تھی۔ ورنہ ذاکر صاحب کے عہد میں اس طرح نیز دوسری نوعیتوں کے توسیعی اور تعمیری منصوبے مختلف شعبوں اور محکموں سے مسلسل آتے رہتے۔ موصوف اپنا تھوڑا سا بھی اطمینان کر لینے کے بعد اور کبھی کبھی محرک کی ہمت افزائی کی خاطر مجوزہ منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی منظوری دے دیتے۔ کام یہاں پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتا تھا بلکہ مجوز سے زیادہ موصوف اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لیے سرگرم سعی ہو جاتے۔

ذاکر صاحب نے کسی شعبہ یا محکمہ کی اصلاحی یا توسیعی اسکیم کو مسترد نہیں کیا' خواہ وہ معمولی اخراجات پر مشتمل ہوتی خواہ کثیر پر۔ یہی اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس اسکیم کو کامیاب بنانے کی کوشش اس شوق اور حوصلے سے کرتے جیسے اس اسکیم کے مصنف اور کار پرداز بھی خود تھے۔ ہم میں سے کسی کی کوئی کتاب 'زیورِ طبع سے آراستہ' نہ ہو پاتی

تو کہیں نہ کہیں سے روپے فراہم کر دیتے۔ یہ نہ کر پاتے تو اپنی جیب سے ادا کرتے اور کبھی کبھی اچھی خاصی بڑی رقم! میرا خیال ہے کہ ذاکر صاحب کے زمانے میں کسی کی کوئی کتاب اس وجہ سے چھپنے سے نہیں رہ گئی کہ اس پر جتنی لاگت آنے والی تھی اس کا مصنف انتظام نہ کر سکتا تھا!

یہ سب اس کے علاوہ تھا جو وہ معلوم نہیں کتنے نادار طلباء اور کبھی کبھی ان کے والدین یا سرپرستوں کی طرح طرح کی دشواریوں کو دور کرنے کے لیے اپنے پاس سے روپے دیا کرتے تھے۔ ڈیوٹی سوسائٹی کی طرف سے اکثر عرض کیا گیا کہ جیب خاص سے دی ہوئی رقوم کی بازیافت کے لیے حسب دستورِ انجمن کوئی دستاویز لکھائی جایا کرے تاکہ وصول شدہ رقم دوسرے مستحق طلباء کو دی جا سکے، اس طرح ڈیوٹی کی بھی مدد ہو جایا کرے گی۔ لیکن موصوف نے اس تجویز کو منظور نہ کیا۔

ذاکر صاحب جس زمانے میں وائس چانسلر ہو کر تشریف لائے، یونیورسٹی تقسیم ملک کے اندوہناک نتائج سے دوچار تھی۔ یونیورسٹی میں یونیورسٹی سے باہر دور اور نزدیک چاہے کسی حیثیت کا آدمی ہو جو کچھ جی میں آتا، سنا کر اور ایک طور پر ہم سے "نیک چلنی کی ضمانت" لے کر چلا جاتا تھا۔ اخبارات میں، کونسل میں، جلسوں میں، ہمارا ہی ذکرِ خیر ہوتا تھا ــــــ خطرے اور خواری کے وہ دن اب تک یاد ہیں۔

ذاکر صاحب کے آتے ہی ایک صبح ایسا معلوم ہوا جیسے ساری فضا صاف، روشن اور خوشگوار ہو گئی ہو۔ اس کے بعد معمولی اور اوسط درجے کے لوگوں کے "نزول اجلال" کا سدباب تو خود ہو گیا۔ پھر یہ ہوا کہ بڑے سے بڑے آدمی بھی دنیا کے کسی گوشے سے آتے، کسی فن کے امام ہوتے، سب سے پہلے انھوں نے "رکھ کے تیشہ کہے ہے یا اُستاد!" ذاکر صاحب کو نذرِ عقیدت پیش کی، ادارے کی خدمات اور خوبیوں کا اعتراف کیا اور رخصت ہوئے تو کچھ اس طرح کا احساس لیے ہوئے، جیسے وہ ایک بڑے شخص اور بڑے ادارے سے مسرور و مفتخر ہو کر جا رہے ہیں۔

ہم میں سے بہتوں کو وہ دن یاد ہو گا جب مہاتما ونوبا بھاوے کا اسٹریچی ہال

میں خیر مقدم کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کے خلاف جھوٹی خبریں بھیجنے اور پھیلانے والوں کو ڈانٹا تھا اور کس سچائی سے، کیسے وقار سے، کتنے کھرے الفاظ اور نڈر لب و لہجہ میں یونیورسٹی کی پوزیشن واضح کی تھی۔ ذاکر صاحب پر وہ جلال، ہاتھ ونوبا بھادے کی پر تقدس و تمکین موجودگی، ہال کے چپے چپے کے طلباء و اسٹاف اور شہر کے اکابر سے بھرا ہونا، موقع اور زمانے کی نزاکت، مجمع پر سکوت کی ایک پر اسرار گرفت، مختصر یہ کہ گذشتہ ۳۵، ۳۶ سال میں اسٹریچی ہال میں ایسی میٹنگ کم سے کم میری نظر سے نہ گزری تھی۔

اس تقریر کے بعد پھر جب تک ذاکر صاحب نے یونیورسٹی سے اپنی علیحدگی کا اعلان نہیں کر دیا، اشرار و انفار کے زبان و قلم کے فتنوں سے ہم اور ہماری یونیورسٹی نہ صرف محفوظ رہی بلکہ ہر جگہ اور ہر موقع پر یونیورسٹی، اسٹاف اور طلباء کے بارے میں تحسین و تہنیت ہی کے کلمے سُنے گئے۔ ذاکر صاحب کے اس احسان، خدمت یا کارنامے کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو اس ادارے کی ناکسی و نامرادی کے وہ دن دیکھ چکے ہیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔

ذاکر صاحب کے وائس چانسلر ہونے سے پہلے اپنا کچھ ایسا حال تھا کہ ملک یا ملک سے باہر کوئی مشہور شخص یا اپنے فن یا مسلک کا کامل آجاتا تو یہ فکر دامن گیر ہوتی کہ مہمان کی رفاقت یا راہ نمائی کے لیے کس شخص کا انتخاب کیا جائے تاکہ ہمارا بھرم قائم رہے اور مہمان خوش و مطمئن اور اس ادارے کی خوبیوں کا معترف ہو کر رخصت ہو۔ بات یہ ہے کہ اتنے دنوں سے اپنی یونیورسٹی کو یونیورسٹی کے درجے سے گرتے اور طرح طرح کی فضیحتوں سے دوچار ہوتے دیکھ چکا تھا کہ آپ اپنی نظر میں سبک ہو چلا تھا اور کچھ اس طرح کا احساس ہونے لگا تھا کہ اپنی روایات، اپنی قوم، اپنی یونیورسٹی یہاں تک کہ اپنے بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں کے بارے میں محبت اور عظمت کی جو رائے رکھتا تھا وہ شاید ایک خود فریبی تھی جس نے میرے احساسات کے احترام میں خوش عقیدگی کا جامہ پہن لیا تھا۔

لیکن جب ذاکر صاحب آ گئے تو ایک ایک کرکے میری تمام خوش عقیدگیوں کی تصدیق ہونے لگی اور ایک دفعہ پھر وہی کالج والی طالب علمانہ یا طفلانہ اسپرٹ عود کر آئی کہ کاش کوئی "بڑا آدمی آئے"، اور ہم کو، ہمارے ادارے کو اور ہمارے بڑے آدمی کو دیکھے۔ چنانچہ اس سات آٹھ سال میں جب تک ذاکر صاحب یہاں رہے جب کبھی یہ سنتا کہ فلاں بڑا آدمی آرہا ہے اور اس زمانے میں کتنے بے شمار منتخب روزگار یہاں آئے تو دل خوش ہو جاتا تھا اور حوصلہ بڑھ جاتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ بڑا آدمی تھا، بلکہ اس لیے کہ ہم کو اپنی بڑائی ثابت کرنے کا موقع ملے گا۔ چنانچہ یہ یقین رہتا تھا کہ مہمان کسی اعتبار سے کتنا ہی عظیم المرتبت کیوں نہ ہو ذاکر صاحب اس سے مل لیے اور گفتگو کر لی تو وہ ہمیشہ ہمارا، ہمارے ادارے کا اور ہم جس بات کی نمائندگی کرتے ہیں اس کا ثنا خواں رہے گا۔

ذاکر صاحب نے یہ روایت طالب علمی کے عہد سے قائم رکھی ہے۔ اُس زمانے میں کبھی یونین میں تقریر کرنے کسی اعتبار سے کوئی یگانۂ روزگار یا یکتائے فن آجاتا تو ہم سب کو بڑی خوشی ہوتی کہ مہمان محترم کا سابقہ ہمارے ایک ایسے ساتھی سے ہوگا جو تقریر ہی کے فن پر نہیں بلکہ مطالعہ و معلومات، ذہانت و خطابت اور شرافت و شگفتگی کے اعتبار سے بھی کالج کا گُلِ سرسبد تھا۔

ذاکر صاحب ہندوستانی "پکّے" گانے اور مصوّری کے جدید اسالیب و رجحانات کے بڑے قدرداں ہیں۔ ہندوستانی موسیقی کے علاوہ یورپین موسیقی کے بھی دلدادہ ہیں۔ ہم میں کم لوگوں کے پاس ہندوستانی اور یوربین موسیقی کے ماہرین کے ایسے منتخب گراموفون ریکارڈس موجود ہوں گے جتنے ذاکر صاحب کے پاس۔ علم و فن کے باکمالوں کو علی گڑھ میں جمع کرنے کی ذاکر صاحب کو بڑی فکر رہتی تھی۔ اکثر کہا کرتے، کاش ایسا ہو سکتا کہ ہندوستانی ساز اور موسیقی کے منتخب روزگار علی گڑھ میں اکٹھا کیے جا سکتے۔ باکمالوں کی جگہ نوجوانوں میں ہے۔

جدید مصوّری سے میری مراد رنگ، خطوط اور زاویوں کا وہ ابہامی یا ایمائی

طوفان و تہلکہ ہے جو باوجود کوشش کے میرے "تخمین وظن" کے خس وخاشاک کے قابو میں کچھ نہ آیا اور کیوں آئے جب دریا بوجود خویش موجے دارد! ذاکر صاحب نے اس طرح کے مصوّری کے نادر اور نمایندہ نمونے جمع کیے ہیں جن میں سے دو ایک دیوار پر آویزاں تھے۔ کبھی کبھی میری نگاہ ان پر جا پڑی اور ذاکر صاحب کی مجھ پر تو ایک لمحہ کے لیے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ہم تینوں یعنی ذاکر صاحب، میرے اور تصویر کے اکسپریشن (EXPRESSION) ایک جیسے ہو گئے ہوں۔

جدید مصوّری اور میرے درمیان اس طرح کی جو دیرینہ بدگمانی چلی آتی تھی اس کا احساس کر کے ذاکر صاحب نے ایک مشہور اور مستند مصنّف کی کتاب مطالعہ کے لیے مرحمت فرمائی، اس بشارت کے ساتھ کہ اس کے مطالعے کے بعد جدید مصوّری کے پرکھنے اور پسند کرنے میں سہولت ہوگی۔ کتاب پڑھ کر واپس کی تو میرے تاثرات دریافت کیے۔ میں نے عرض کیا کہ اس کتاب کے مصنّف پر میرے کچھ "اخلاقی" اعتراضات ہیں۔ اوّل تو معلوم نہیں کیوں اور کیسے اسے میری طرف سے سوءظن ہے کہ میں اس کی باتوں پر دھیان نہ دوں گا، اس لیے اچھی خاصی سمجھ میں آنے والی بات بھی ڈانٹ ڈانٹ کر سمجھاتا ہے۔ جیسے کچھ اس طرح کا مطلب ہو کہ نہ سمجھوں تو بھاڑ میں جاؤں۔ دوسرے یہ کہ اس نے آرٹ کے بڑے نازک، بلیغ نکتے واضح کیے ہیں، جن کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن ثبوت یا مثال میں جب وہ انھیں "شاہکاروں" کا حوالہ دیتا ہے جن سے میں "رنج ہوں"، یا جن پر وہ نکتے مرکوز ہیں جن میں سے چند آپ کی ملکیت میں ہیں تو میں جہاں کا تہاں رہ جاتا ہوں۔ میں جسے "بنائے مخاصمت"، بتاؤں مصنّف اپنے لیے اس کو "سندِ جواز" قرار دے تو انصاف کیجیے "مرد ناداں" کدھر جائے، جس کی نہ بھر تری ہری سنتے ہیں نہ ڈاکٹر اقبال۔

ذاکر صاحب کے چہرے پر شکن نہ پا کر میں نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا اور عرض کیا، ذاکر صاحب آپ مجھ سے بدگمان نہ ہوں، یہ طرح طرح کے ہیولے سر آنکھوں پر، لیکن یہ آرٹ کا نمونہ نہیں ہیں۔ بلکہ ہمارے حیوانی یا شہوانی مطالبات یا میلانات کی سائنٹفک تصویریں یا تعبیریں ہیں، جن کا جمالیات سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے بعد گفتگو کا دروازہ بند ہو گیا اور تصاویر زیرِ خند فرماتی رہیں۔

ذاکر صاحب کی ایک صفت جو اُن کے درجے کے دوسرے لوگوں سے ان کو ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ کیسی ہی اہم تقریب کیوں نہ ہو اس کے لیے خطبہ لکھنا ہوگا تو وہ خود لکھیں گے، کسی دوسرے کی مدد کے خواستگار نہ ہوں گے۔ باوجود اس کے کہ اس موضوع پر معتبر و مستند لکھنے والے اور اس خدمت کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھنے والے ان کے قریب کافی تعداد میں موجود ہوں گے۔ اس بارے میں وہ کسی فنی مشیر یا ماہر کے کبھی محتاج نہ ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں ہندوستان میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی نہیں جن کی تقریریں اور بیانات ماہرینِ فن نہ تیار کرتے ہوں۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایسے اصحاب اس درجہ عدیم الفرصت ہوتے ہیں کہ تقریر لکھنے پر زیادہ وقت اور توجہ نہیں صرف کر سکتے۔

لیکن یہ "بقلم خود" لکھنے کا اصول یا عادت ذاکر صاحب کے لیے بلائے جان سے کم نہیں۔ چنانچہ اس طرح کے مواقع جب کبھی پیش آتے ہیں اور کثرت سے آتے رہتے ہیں تو وہ اتنے مضطرب ہوتے ہیں کہ آس پاس کے لوگ آسانی سے سمجھ جاتے ہیں کہ موصوف کسی خطبے کی کوفت میں ہیں۔ اضطراب کی تشخیص "خطبہ" اس لیے کہ ذاکر صاحب کسی اور سبب سے مضطرب نہیں پائے گئے۔

اضطراب کا سبب یہ ہوتا ہے کہ خطبہ لکھنے کا اہتمام وہ یہ حساب لگا کر کرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ خطبہ لکھنے کا کام ختم کرنے اور اس کے پڑھے جانے کے درمیان تھوڑا سا بھی فصل زمانی باقی رہ جائے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ آج تک ایسا نہ ہوا کہ خطبہ نامکمل رہ جائے یا اپنی جگہ پر بے مثل نہ ہو۔

علی گڑھ والوں کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ جس کام کو وہ بہترین طور پر انجام دینا چاہتے ہیں اس کو بالعموم "گیارہویں" گھنٹے میں شروع کرتے ہیں اور بارہویں پر ختم کر دیتے ہیں۔ جہاں تک خطبہ لکھنے کا تعلق ہے ذاکر صاحب نے اس ریکارڈ کو بہتر بنانے کی مزید کوشش اس طور پر کی ہے کہ کام بارہویں گھنٹے میں شروع کیا جائے اور اس سے کچھ پہلے مکمل کر دیا جائے۔

دوسری صفت یہ ہے کہ وہ ایسے موضوع پر بھی جو خصوصیت کے ساتھ ان کے مطالعہ میں نہ رہا ہو ایسی جچی تلی اور اتنی فکر انگیز بات کہتے ہیں جو شاید کوئی ماہرِ فن

بھی نہ کہہ پاسے۔ ہر طرح کی کانفرنس اور جلسوں میں خطبات اور تقریریں سنتے زمانہ گزرا لیکن اکثر ہوا یہ کہ یا تو بندھی ٹکی باتیں سنیں جن سے طبیعت اکتائی یا اصطلاحات کی بھرمار سے سابقہ ہوا جو سمجھ میں نہ آئیں۔ لیکن ذاکر صاحب کے خطبات یا تقریروں میں خواہ وہ ڈاکٹری سے متعلق ہوں، خواہ انجینیری سے خواہ کسی ٹکنیکل موضوع سے، ہمیشہ ایسے نکتے سُننے میں آئے جن سے عالم اور عامی دونوں متأثر اور مسرور ہوئے کبھی بات سے کبھی کہنے کے انداز سے اکثر دونوں سے۔ مصرعِ طرح کیسا ہی ہو ذاکر صاحب اس پر اچھی سے اچھی غزل کہہ سکتے ہیں۔

سبب وہی ہے جس کی طرف ابتداء میں اشارہ کر چکا ہوں۔ یعنی ذاکر صاحب کو ہر بات سے دل چسپی ہے۔ ان میں زندگی کے نہاں کو، آشکار سے پیچیدہ کو آسانی سے سادگی کو پرکاری سے ربط دینے یا ایک کو دوسرے سے تعبیر کرنے کا حیرت انگیز ملکہ ہے اور یہی وہ بات ہے جو ان کے ہر بیان میں جان پیدا کر دیتی ہے۔

عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

میرا خیال ہے کہ یونیورسٹی کے ہر چھوٹے بڑے پر ذاکر صاحب کا بحیثیت مجموعی جتنا اچھا اور دیرپا اثر پڑا ہے کسی دوسرے کا ان سے قبل نہیں پڑا تھا، باستثنا سرسید اور ان کے قریبی رفقاء کے۔ اس اثر کی اہمیت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ بھی ملحوظ رکھیں کہ ذاکر صاحب نے جب اس ادارے کا کام سنبھالا تو اس کی شہرت مجروح اور عام فضا مکدر ہو چکی تھی، ایسی مجروح اور مکدر جیسی پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی نہ سُنی۔ اور جب یہاں کا کام چھوڑا تو یونیورسٹی کی شہرت بحیثیت یونیورسٹی کے دور دور ملکوں تک پہنچ چکی تھی اور اس کی ظاہری شکل وصورت ہر اعتبار سے پہلے سے بدرجہا بہتر ہو گئی تھی، جس کو ایک اجنبی بھی یونیورسٹی کے حدود کے اندر قدم رکھتے ہی محسوس کر لیتا تھا۔

یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اوروں سے قطع نظر طلباء کی تقریروں اور تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ ان میں ذاکر صاحب کی طرح سوچنے، لکھنے اور تقریر

کرنے کا انداز اور معمولی سطح سے بلند ہو کر بات کہنے اور کرنے کا سلیقہ آچلا ہے۔

• ذاکر صاحب یہاں آئے تو یونیورسٹی کا بجٹ کم و بیش ۱۳ لاکھ تھا اور جب رخصت ہوئے تو غالباً ۴۴ ۵ لاکھ تک پہنچ چکا تھا۔ اس میں وہ پرائیوٹ عطیات شامل نہیں ہیں، جو ذاکر صاحب کے عہد میں ذاکر صاحب کے اثر سے وصول ہوئے ——— قیاس ہے کہ یہ رقم ۲۰ لاکھ تک پہنچتی ہے ——— موصوف کا یہ کارنامہ اس ادارے کی جدید تاریخ میں یادگار رہے گا جب پرائیوٹ عطیات کا دروازہ تقریباً بند ہو چکا ہے۔

ذاکر صاحب بالعموم ہر اسکیم بڑے پیمانے پر سوچتے ہیں اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مشورہ کسی ماہر فن سے لیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بڑے پیمانے پر سوچنے اور ماہر فن سے مشورہ کرنے میں ہرگز بخل نہ کرنا چاہیے، البتہ اسکیم کو عملی شکل دینے میں اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ ہمارے ذرائع اور وسائل کس حد تک ہمارا ساتھ دے سکیں گے۔

یہ اس کا نتیجہ ہے کہ ذاکر صاحب کے قیام کے زمانے میں یونیورسٹی کی توسیع اور تزئین کا جو کام ہوا ہے اس کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ مدتوں ان میں بنیادی ردو بدل کی ضرورت پیش نہ ہوگی۔ اب تک وسیع پیمانے پر نہ سوچنے اور ماہر فن سے مشورہ نہ کرنے کا یہ نتیجہ رہا ہے کہ یونیورسٹی میں زیادہ تر چیزیں خواہ وہ عمارت ہوں، سڑک ہو، درخت ہوں، سب "خودرو" سے معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی جس سے جہاں بن پڑا نمودار ہو گیا۔ ظاہر ہے اس کا سبب وہ ناقابلِ تسخیر دشواریاں تھیں جن سے ہمارا ادارہ شروع سے اب سے چند سال پہلے تک دوچار رہا۔

کوئی ضخیم کتاب یا فائل ہو، کانفرنس ہو جلسہ ہو، پرائیویٹ یا پبلک، متنازعہ فیہ مسئلہ ہو، ذاکر صاحب ان میں وہ تمام امور جلد سے جلد اخذ کر لیں گے جو مفید مطلب، تصفیہ طلب یا یوں کہیے جانِ سخن ہوں گے ——— پھر ان کا ذہن اتنا رسا، حافظہ قوی اور طبیعت شریفانہ ہے کہ تصفیہ یا مفاہمت کا جو فارمولا وضع کریں گے وہ ہر فریق کے لیے قابلِ قبول ہوگا۔ میں نے آج تک کوئی ایسی میٹنگ نہ دیکھی جہاں ذاکر صاحب تشریف

رکھتے ہوں اور مناقشہ یا مباحثہ غیر معمولی حد تک کھنچا ہو۔ مثلاً یونیورسٹی کی کمیٹی، کونسلوں میں شاید ہی کبھی کوئی ایسا فیصلہ ہوا ہو جس پر سب نے اتفاق نہ کیا ہو، حالانکہ بحث مباحثے میں جس کسی کا جی چاہتا تھا بڑی آزادی سے حصہ لیتا تھا۔

ذاکر صاحب کا مطالعہ بڑا وسیع اور متنوع ہے۔ یونیورسٹی میں کم ایسے لوگ ہوں گے جو موصوف کے مانند کثیر المشاغل اور عدیم الفرصت ہوں یا جن کی ضمنی دلچسپیاں HOBBIES اتنی ہوں جتنی ذاکر صاحب کی۔ اس کے باوجود مطالعہ کتب پر اتنی توجہ اور وقت صرف کرتے ہیں جتنا ذاکر صاحب ——— اردو کی مطبوعات اور رسائل کا بھی اسی شوق اور انہماک سے مطالعہ کرتے ہیں جس سے انگریزی اور جرمن مصنفوں کی کتابوں کا۔

ذاکر صاحب اُردو کے نئے پُرانے شعراء اور ادیبوں کی تصانیف نیز نئی پُرانی تحریکوں پر اچھی نظر رکھتے ہیں۔ اردو کے تقریباً تمام مستند رسالے اور تصانیف ہدیتہً ذاکر صاحب کے ہاں آتے رہتے ہیں۔ مدیران و مصنفین مجھ پر بھی کرم کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب کبھی ذاکر صاحب سے ملاقات ہوتی تو یہی معلوم ہوا کہ وہ کتاب یا رسالہ جو صرف ایک رات پہلے ہم دونوں کو موصول ہوا تھا ذاکر صاحب کی نظر سے بالتفصیل گزر چکا تھا اور میں اسے ہاتھ تک نہیں لگا پایا تھا! اور یہ معلوم اس لیے ہوتا تھا کہ موصوف ہی اس کا ذکر چھیڑتے تھے۔ یہاں تک غنیمت ہے، تعجب تو اس وقت ہوتا ہے جب ان کتابوں یا رسائل کے موضوعات اور مضامین پر اس خوبی سے اظہار کرتے ہیں اور ایسے پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے یہ خیال ہونے لگتا ہے جیسے تنقید و تبصرہ ان کے مطالعے کا دیرینہ اور دل پسند موضوع رہا ہو۔

ذاکر صاحب مدت دراز سے اپنی پسند کے فارسی اشعار ایک بیاض میں درج کرتے رہتے ہیں، جس کی مجموعی تعداد کئی ہزار تک پہنچ چکی ہے ——— یہ بیاض ہر طویل سفر میں ساتھ رہتی ہے۔ ان اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کا فارسی کا ذوق کتنا پاکیزہ ہے اور جذبات و خیالات کی نزاکت و لطافت سے قطع نظر جن کے یہ اشعار حامل ہیں، خود شاعری جس حسنِ خیال اور حسنِ اظہار سے

تعبیر کی جاتی ہے، اس کے ذاکر صاحب کتنے معترف اور کیسے معتقد ہیں۔
اس کا سب سے واضح اور دل کش پرتو ان کی اردو کی تحریروں میں نظر آئے گا۔
جس میں فکر و نظر کو انشا پردازی کے رقص و رامش میں اس طرح تحویل کیا ہے کہ یہ بتانا
مشکل ہو جاتا ہے کہ کون کس کی رہینِ منّت ہے۔ مدّت ہوئی کہیں ذاکر صاحب کی
تحریر و تقریر پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے میں نے غالبؔ کا مصرع لکھا تھا۔

ریحاں و مداز مینا، رامش چکداز قلقل

ذاکر صاحب کی قابلیت اور ذہانت کا اظہار یوں تو ہر موقع پر ہوتا رہتا ہے،
لیکن بدیہہ آفرینی میں اور برجستہ جوابی کے الماس ریزے اور برق پارے اس وقت
دیکھنے میں آتے ہیں جب وہ حریف کی ناانصافی یا نالائقی پر برہم ہو جائیں۔ طالب علمی
کے زمانے میں یونین میں بھی ان کی معرکے کی تقریر وہ ہوتی تھی جب مباحثہ کے محرک
ہونے کی حیثیت سے وہ مخالفین کے جواب میں سب سے آخر میں تقریر کرتے تھے۔
ان کی تقریر و تحریر کے ساتھ آج کم و بیش آٹھ سال کا ساتھ بھی یاد آرہا ہے۔

ذاکر صاحب سے ملنے اور ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کا
ہر اس شخص کا دل چاہے گا جو ان سے خلوص نیت کے ساتھ کبھی مل چکا ہو۔ اس لیے
کہ وہ ملنے والے سے اس شفقت سے پیش آتے ہیں اور اس کی اتنی عزّت کرتے
ہیں کہ اس میں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اس کی بھی اہمیت ہے۔ یہ احساس خود کو
بحیثیت مجموعی سوسائٹی کے لیے مفید اور خود اپنی نظر میں قابلِ وقعت بنا دیتا ہے۔
سبب وہی ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے یعنی ذاکر صاحب کا ہر شخص اور ہر چیز سے
دل چسپی لینے کا شوق اور ان کو بہتر بنانے کا حوصلہ۔ وہ جیسے کسی خول میں نہ رہتے
ہوں۔ جہاں سے نکلنے میں ہر ایسے شخص کو تامّل ہوتا ہے جو کبھی خود پرستی کے لیے
اور اکثر ناسازگار حالت سے بچنے کے لیے "جائے پناہ" کے طور پر بنا لیتا ہے۔
بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھوں نے اپنے لیے کسی نہ کسی طرح کا خول نہ بنا رکھا ہو۔
ذاکر صاحب کو اس طرح کی باتوں سے دور دور کا واسطہ نہیں۔

موصوف کافی دنوں یہاں کے وائس چانسلر رہے، لیکن میرے لیے وہ وہی ذاکر صاحب رہے جو کبھی کچی بارک میں تھے یا قرول باغ اور جامعہ نگر میں۔ یقیناً ان کے اور بھی ایسے ساتھی ہوں گے جنھوں نے ذاکر صاحب کو شروع سے آخر تک ذاکر صاحب ہی پایا۔ اپنی حیثیت بنانے یا منوانے میں ذاکر صاحب کبھی کسی عہدہ منصب یا پیروی اور پروپیگنڈے کے محتاج نہ تھے اور مجھے یقین ہے وائس چانسلر رہنے پر بھی بھروسہ وہ اپنے ذاکر حسین ہونے پر کرتے رہے۔ ذاتی طور پر میں اسی شخص کو بڑا سمجھتا ہوں جو اپنی بڑائی کے لیے کسی اضافے یا خارجی شے کا محتاج نہ ہو۔

ذاکر صاحب ہر موقع اور ہر حال میں بڑے اچھے ساتھی ہیں۔ وہ آپ کی تفریح، راحت اور رکھ رکھاؤ کا ہمہ وقت لحاظ رکھیں گے خواہ وہ خود کسی حال میں ہوں اور اس لطف اور بے تکلفی سے کہ آپ پر یہ ظاہر نہ ہو کہ وہ ایسا کر رہے ہیں۔ آپ دل گرفتہ ہوں یا آپ میں خدا نخواستہ عیب کی حد تک کوئی کمزوری ہو تو ذاکر صاحب سے مل کر دونوں کو بھولنے لگیں گے اور کچھ اس طرح محسوس کریں گے جیسے زندگی اور دنیا لطف اٹھانے کی بھی جگہ ہے اور تکلیف اٹھانے کی بھی۔ جتنی اپنے لیے اس سے زیادہ دوسروں کے لیے، مایوسی اور بے ہودگی کے لیے نہیں۔ محنت اور سلیقے سے کام کرنے کی داد جس قدر دل کھول کر اور خوش ہو کر ذاکر صاحب دیتے ہیں کوئی اور کم دے گا۔ اس لیے کہ اس طرح کام کرنے کی آزمائش اور لطف سے جس طرح وہ گزر رہے ہیں شاید ہی کوئی اور گزرا ہو۔ جس کے کام سے خوش ہوتے تھے اس شخص کا اور اس کے کام کا بار بار اور مدتوں مناسب موقع اور محل پر ضرور ذکر کرتے، خواہ وہ آدمی چھوٹا ہوتا یا بڑا یا اس کا کام۔

علالت کی مسلسل کم و بیش خلش سے ادھر ذاکر صاحب کچھ بے کیف رہنے لگے تھے اور کبھی کبھی معمولی باتوں پر بھی بے لطف ہو جایا کرتے تھے۔ اس کا سبب تنہا علالت نہ تھی بلکہ کچھ اور طرح کی ناسازگاریاں بھی تھیں جو یقیناً سنگین نہ تھیں اور عام طور پر اس شخص کو پیش آتی رہتی ہیں جس کے سپرد اتنا بڑا کام ہو، لیکن ان سب

مل کر کچھ ایسی صورت پیدا کر دی کہ ذاکر صاحب کو علی گڑھ یہ چھوڑنے پر رامنی نہ کیا جا سکا۔
ذاکر صاحب طبیعت اور تربیت کے لحاظ سے معلم ہیں اور رہنا بھی یہی چاہتے ہیں۔ معلم کا سب سے اونچا درجہ پیغمبر ہے۔ لیکن پیغمبروں میں ایڈمنسٹریٹر (ADMINISTRATOR) غالباً کم ہی گزرے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر کی طرف لانے اور بلانے کا کام پیغمبروں کے سپرد کیا ہے اور انسان کو اشرار سے بچانے کے کام پر دوسری طرح کے لوگوں کو مامور کیا ہے۔ دونوں کا طریقۂ کار جداگانہ ہے۔ گو جب اقبال کہتے ہیں کہ عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد! تو ان کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبری میں بھی تشدّد بغیر "چارہ نہیں" چاہے وہ تشدّد اور پیغمبری حضرت موسیٰ ہی سے شروع اور انھیں پر ختم ہو گئی ہو۔ ممکن ہے "لاٹھی چارج" کی تلمیح بلیح بھی اس وقت سے چلی آرہی ہو۔

ذاکر صاحب نسلاً کھرے پٹھان ہیں، لیکن پیشہ اختیار کیا معلّمی کا۔ "اس نصیبہ پر کیا اختر شناس"۔ اس ستم ظریفی کا انجام ظاہر ہے کیا ہوگا۔ ان کی قوم کے ایک فرد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ افلاس سے تنگ آکر خانہ نشین ہو گئے اور وہاں سے بیوی کے دمبدم طعنے اور شب و روز کے فاقے سے نیم جاں ہو کر بھیک مانگنے نکلے، تھوڑی دور گئے تھے، کچھ یاد آیا، واپس ہوئے۔ بیوی نے پوچھا کیا ہوا، بولے کھونٹی پر تلوار لٹکی ہے اسے لادو۔ نیک بخت نے کہا، نکلے تو ہو بھیک مانگنے تلوار کا کیا کرو گے؟ فرمایا اور کہیں حجت ہو گئی تو کیا تلوار لینے گھر آؤں گا!

پروفیسر خواجہ غلام السّیدین

خواجہ غلام السّیدین صاحب، ذاکر صاحب کے بہت قریبی دوستوں میں سے ہیں، اُن کی شخصیت سے بہت متأثر ہیں۔ اور ان سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔ وہ علی گڑھ میں ذاکر صاحب کے ہم سبق تو نہیں مگر ہم عصر ضرور تھے۔ آگے چل کر قومی تعلیم کے بہت سے اہم کاموں میں خصوصاً بنیادی تعلیم کا اساسی نصاب مرتب کرنے میں دونوں کا ساتھ رہا۔ اس مبسوط اور جامع مضمون میں، جو اگلے صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے، خواجہ صاحب نے ذاکر صاحب کے تعلیمی فکر و عمل پر عالمانہ نظر ڈالی ہے۔

مردِ مومن

ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ جو عالم ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو

دنیا میں دو طرح کے لوگ ہیں، ایک وہ (ان کی تعداد بے شمار ہے) جو ہوا کے رُخ کو دیکھ کر چلتے ہیں اور پانی کے بہاؤ کو دیکھ کر تیرتے ہیں اور دوسرے وہ (اور یہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں، لیکن زندگی میں انھیں کے وجود سے نمکینی ہے) جو اپنی عقل اور ضمیر کی روشنی میں اپنا راستہ متعین کرتے ہیں اور باوجود مخالفت اور مشکلات کے اس راہ میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ دنیاوی کامیابی اور عیش و آرام اکثر پہلوں کے حصّے میں آتے ہیں، لیکن حقیقی نیک نامی اور خدمت کی سعادت دوسروں کے قدم چومتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جو اپنے زمانے کو نئی قدروں سے آشنا کرتے ہیں اور انھیں کے طفیل زندگی کی نبض زیادہ تیز، اس کے امکانات زیادہ وسیع اور اس کی معنویت زیادہ گہری ہو جاتی ہے۔ ذاکر صاحب کا شمار ایسے ہی خلاق لوگوں میں ہے۔

قدرت انسانوں کے معاملے میں کبھی اپنی جزرسی کا اظہار کرتی ہے، کبھی فیاضی کا۔ بیشتر انسان تو دل و دماغ کے اعتبار سے اس قدر گھٹیا ہوتے ہیں کہ ان کے وجود کی مصلحت کو سمجھنا ہی مشکل ہے، لیکن کبھی کبھی قدرت بعض انسانوں کو ایسی فیاضی کے ساتھ نوازتی ہے اور اپنے خزانے اُن پر اس قدر بے دریغ نچھاور کرتی ہے کہ عقل

حیرت میں رہ جاتی ہے اور ایمان کی لو زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔" اچھے انسان" کی جھلک ایسے لوگوں کی ذات ہی میں دکھائی دیتی ہے اور اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت کے سامنے" انسان" کا کس قدر بلند تصور ہے۔ جس شاعر نے نیازمندانہ گستاخی سے دستِ قدرت کو طعنہ دیا تھا کہ مٹی کے کھلونے بنانا تیرے شایانِ شان نہیں (لعبت خاک ساختن می نہ سزد خدائے را)' اس نے بے صبری اور مصلحت ناشناسی کو یہ کہہ کر تسکین بھی دی تھی کہ

مشو نومید زیں مشتِ غبارے — پریشاں جلوۂ ناپائدارے
چو فطرت می تراشد پیکرے را — تمامش می کند در روزگارے

جس طرح ہلال کی تنگ نائے میں بدرِ کامل کا جمال جہاں آرا پوشیدہ ہے' اسی طرح اس کم مایہ انسان میں وہ حیرت ناک امکانات موجود ہیں' جن کا جلوہ ہمیں کبھی کبھی بعض خاصانِ خدا کی ذات میں نظر آجاتا ہے' ان کو دیکھ کر ہمیں اس مہ و افلاک سے بلند تر منزل کا سراغ ملتا ہے' جس کی طرف بڑھنے کی کوشش انسان ٹمٹاتی آنکھوں اور لڑکھڑاتے قدموں سے کرتا رہتا ہے' لیکن یہ راستہ اس قدر صبر آزما اور دشوار گزار ہے کہ ہزاروں مسافر ہر ہر قدم پر تھک کر رہ جاتے ہیں' صرف وہ تھوڑے سے لوگ اس منزل کے قریب پہنچ پاتے ہیں' جن کو تائیدِ الٰہی حاصل ہے

ذاکر صاحب کا شمار انھیں گنے چنے لوگوں میں ہے' ان پر قدرت نے صورت اور سیرت' دل اور دماغ' شرافت اور دیانت' دوستی اور قیادت کی غیر معمولی صفات ارزاں فرمائی ہیں۔ لیکن وہ اس کو اس استغنا اور خود اعتمادی اور سادگی کے ساتھ برتتے ہیں کہ سرسری نگاہ سے دیکھنے والوں کو ان کا اندازہ نہیں ہوتا اور گہری نگاہ سے دیکھنے والوں کو ان کی بلندی اور عظمت گراں نہیں گزرتی' یہ چیز بجائے خود انسانی شرف کے لیے ایک بڑی سخت کسوٹی ہے۔ ذاکر صاحب ان لوگوں میں نہیں جو اپنی بزرگی کی دوکان لگا کر بیٹھتے ہیں اور خریداروں کو باصرار وہاں آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کو شاید خود بھی اپنی قدر و قیمت کا پورا احساس نہیں یا اگر ہے تو ایسا ہی جیسا گلاب کے پھول یا شبِ ماہتاب کو ہوتا ہے' یعنی ان کے لیے خوشبو دینا اور روشنی پھیلانا عین فطرت ہے' اس کے لیے کسی تعریف یا معاوضہ کا مطالبہ ان کے

ذہن میں آہی نہیں سکتا!

میرا خیال ہے اور غالباً ذاکر صاحب کے بہت سے دوست اور جاننے والے اس سے اتفاق کریں گے کہ وہ جس شعبۂ زندگی کو اپنے لیے اختیار کرتے اس میں اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت شہرت، مقبولیت اور کمال حاصل کرسکتے تھے۔ ایک اتفاق تھا کہ وہ ڈاکٹر ہوتے ہوتے رہ گئے۔ طب کی تعلیم شروع کرکے چھوڑنی پڑی۔ ورنہ عجب نہ تھا کہ وہ ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کا زخم مندمل کر دیتے۔ فطرت کی ستم ظریفی نے ان کو ہندوستان کے غلام آباد میں پیدا کیا۔ اگر وہ کسی آزاد اور قدرشناس ملک میں پیدا ہوتے تو اس کی سیاسی زندگی میں ان کے لیے مقام اعزاز مخصوص ہوتا اور ملک کی سیاست اور اخلاق کا ٹوٹا ہوا ناتہ جوڑنے کا فرض انجام دیتے۔ اگر وہ وکالت کا دولت آفریں پیشہ اختیار کرتے تو ان کی تقریر کی قابلیت، ان کی نکتہ رسی، ان کی حاضر جوابی، حشو و زوائد سے گزر کر بنیادی امور کی گرفت ان کو صفِ اوّل میں جگہ دلاتی۔ ان میں سمجھ داری ہے، خلوص ہے، ذاتی کشش ہے اور یہ تینوں صفات مل کر انسان کو ایسی قوت بخشتی ہیں کہ وہ جس کام کو ہاتھ میں لے اسے ایک امتیازی شان کے ساتھ انجام دے سکتا ہے۔ سمجھ داری راستہ دکھاتی ہے، خلوص کا انعام تائیدِ الٰہی ہے اور ذاتی کشش کی وجہ سے دوستوں اور ساتھ کام کرنے والوں کی رفاقت، وفاداری اور اعتبار کی دولت میسّر آتی ہے اور کام کرنے میں سہولت ہوتی ہے.... تعلیم کی خوش قسمتی ہے کہ انھوں نے اپنی ذات کے لیے اس کو اختیار کیا۔

لیکن کسی غیر معمولی قابلیت کے شخص کے لیے اس میدان کو پسند کرنا بجائے خود ایک خلافِ توقع سی بات ہے، کیوں کہ اس میں بڑے صبر اور ایثار کی ضرورت ہے، انسان دوستی اور جذبۂ خدمت کی ضرورت ہے اور نفس کو مار کر محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ صفات بالعموم ایسے لوگوں میں نہیں پائی جاتیں، وہ اپنی ذہنی قابلیت کی بہت اونچی قیمت لگاتے ہیں اور اسے بہت جلد دولت، قوت، رسوخ، شہرت اور لیڈری کے سکّوں میں وصول کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے لیے عام طور پر سیاست یا وکالت یا ملازمت کا میدان پسند کرتے ہیں، جہاں یہ تمام چیزیں آسانی سے ہاتھ آسکتی ہیں یا کم سے کم ایک دل کش سراب کی طرح دسترس کے اندر معلوم ہوتی ہیں۔

اس لیے بیشتر لوگ ان چاک دار نگینوں کی خاطر اپنا سب کچھ تج دیتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل کی گرمی اور دماغ کی روشنی جو شاید ان کے ہم جنسوں کی شب تاریک کو سحر کرتی محض ان کی زندگی کی تنگ کوٹھری کو گرم اور روشن رکھتی ہے۔ لیکن ذاکر صاحب ان غیر معمولی لوگوں میں سے ہیں، جن کا خیال ہے کہ قوموں کے بنانے میں معلّم کے خاموش اور جانکاہ کام کی اہمیت ارباب سیاست کی تگ و دو اور شور و غل سے زیادہ ہے یعنی ان کو آتش بازی اور تاروں کی ٹھنڈی روشنی کا باریک فرق معلوم ہے۔ معلّم انسانوں کے دل و دماغ میں ان بنیادی صفات کا بیج بو سکتا ہے جن پر نہ صرف پائدار سیاسی کامیابی کا انحصار ہے بلکہ جن کے بغیر سچی الفرادی اور جماعتی شرافت کا حصول ناممکن ہے۔ اگر افراد میں یہ صفات موجود نہ ہوں تو سیاست کی ساری کشمکش اور جدوجہد ایسی ہے جیسے ریت میں ہل چلانا یا سمندر کے پانی کو بلو کر اس میں سے دودھ نکالنے کی کوشش! ذاکر صاحب کا یہ انتخاب کار بجائے خود ان کی سیرت کے ایک روشن اور مرکزی پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جب انسان کے سامنے بہت سی راہیں کھلی ہوں اور ہر ایک زندگی کی کامرانیوں کو پیش کرتی ہو اور وہ تکلیف کو راحت پر، خدمت کو حکومت پر، ایثار کو دولت پر ترجیح دے تو وہ عقل دنیادار کی نگاہ میں عقل کا دشمن ہے۔ ایک واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ اور انسان کی ترقی میں ایسے جنوں کا مقام عقل سے کہیں بلند ہے:

ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے
جس نے سیے ہیں ادراک کے چاک

ذاکر صاحب کے تعلیمی خیالات اور منصوبوں اور زندگی کے اصولوں پر مفصّل بحث کرنے کے لیے ایک مفصّل کتاب درکار ہے، اس وقت میرا مقصد محض چند ایسی باتوں کا ذکر کرنا ہے، جن کا تعلق ان کے تعلیمی کام اور ان کی ذات دونوں سے ہے، کیوں کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کے اصول اور عمل، عقیدہ اور پالیسی میں ہم آہنگی ہے، جن کا دل ان کے دماغ سے مصروف پیکار نہیں رہتا اور زبان دل کی ترجمانی کرتی ہے، ان کی تمام شخصیت میں وہ توازن جاری اور ساری ہے جو یونان کے فلاسفہ اور اسلام کے معلّمین اخلاق کی نظر میں انسانیت کا بہترین جوہر ہے، اس لیے ذاکر صاحب کی

شخصیت کو سمجھ لینے سے ان کے تعلیمی خیالات کی کنجی بھی ہمارے ہاتھ میں آجاتی ہے۔

میرے خیال میں ذاکر صاحب کی سب سے نمایاں صفت انسانی زندگی کی قدروں کی صحیح پرکھ ہے۔ وہ کاموں اور مقصدوں کی اضافی قدر و قیمت کا بہت صحیح اندازہ لگاتے ہیں۔ بہت سی چیزیں جو دوسرے لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہیں، ان کی نگاہ اور ان کے دل کو کبھی مرعوب نہیں کر سکتیں یہ بظاہر معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل ایک کمیاب صفت ہے اور خوش نصیب ہے وہ انسان جو آزمائشوں اور تحریصوں کی یورش میں اپنے نظام اقدار کو درست رکھے اور اس کی حفاظت کر سکے۔ دراصل تعلیم کا سب سے بڑا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ انسانوں کو قدروں کی پرکھ سکھائے۔ اس لیے ایک اچھے معلّم کے ذہن میں انسان اور اس کی دنیا کی صحیح تصویر ہونی چاہیے تاکہ وہ اہم اور غیر اہم، اصلی اور نقلی، سچی اور جھوٹی باتوں میں تمیز کر سکے۔ اگر اس کے خیال اور عمل میں غلط اور کم عیار چیزوں کی عزت اور محبت نہیں ہوگی تو اس کے شاگرد بھی خود بخود انھیں چیزوں کا احترام کریں گے۔ ذاکر صاحب کی عظمت بحیثیت ایک معلّم کے دراصل اس وجہ سے نہیں کہ ان کو موجودہ اور قدیم تعلیمی اصولوں اور طریقوں سے بہت اچھی واقفیت ہے یا انھوں نے ایک بہت مشہور درس گاہ کی بنیاد ڈالی ہے اور اس کو پروان چڑھایا ہے، بلکہ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان کی اپنی ذات ہماری بہترین اخلاقی اور تہذیبی قدروں کی حامل ہے اور عصر حاضر کے شیطانی ہیجان میں انھوں نے اپنے مذاقِ سلیم اور احساس صالح کو قائم رکھا ہے اور یہ چیز علم اور عمل کے کارناموں سے بھی کہیں زیادہ وقیع ہے۔

آوازۂ خلیل ز بنیاد کعبہ نیست
مشہور گشت زاں کہ بآتش نکو نشست

ذاکر صاحب کی قدروں کا اندازہ آپ کو دو مثالوں سے ہو جائے گا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ تعلیم کے میدان میں دولت کو علم کا خادم ہونا چاہیے، علم کو دولت کا دست نگر نہیں بنانا چاہیے۔ اگر ارباب دولت و حکومت اپنی دولت یا قوت کے بل پر تعلیم گاہ یا تعلیمی نظام پر قابض ہو جائیں اور اس کی آزادی کو چھین کر اپنا آلۂ کار بنالیں تو تعلیم کی روح مردہ ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ اپنے اصل مقصد کو پورا نہیں کر سکتی۔

ہندوستان میں تعلیم پر حکومت کا، مغربی ممالک میں دولت اور حکومت دونوں کا تسلط رہا ہے اور اس کے نتائج نگاہِ عبرت نے بار بار دیکھے ہیں۔ لیکن ذاکر صاحب کی طرح کم لوگوں کو توفیق ہوئی، زبان سے نہیں (وہ تو آسان ہے) عمل سے اس خطرے کے خلاف آواز بلند کرنے کی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لیے یہ کام بہت مشکل اور صبر آزما ہے، کیوں کہ اس میں مانگنے والے کو مجبوراً اپنی خودداری کو آلودہ کرنا پڑتا ہے لیکن ذاکر صاحب کا چندہ جمع کرنے کا ایک نرالا انداز ہے اور کوئلوں کی اس دلالی میں بھی انھوں نے اپنے ہاتھوں کو پاک و صاف رکھا ہے اور جامعہ کی روح کی عفت کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔ ابتداء میں تو انھوں نے اس مقصد کے لیے اربابِ ثروت کی طرف رجوع ہی نہیں کیا، بلکہ غریبوں اور متوسط طبقے کے لوگوں کا ایک ایسا حلقہ "ہمدردان" قائم کیا جو تھوڑا تھوڑا چندہ باقاعدگی کے ساتھ دیتے تھے اور رسالہ ہمدردِ جامعہ کے ذریعے درس گاہ کے حالات اور اس کی ترقی اور مشکلات سے آگاہ رہتے تھے۔ اس طرح ابتدا سے جامعہ کا تعلق عوام کے ساتھ قائم ہو گیا جو ہر قومی ادارے کی صحت کے لیے ایک شرط لازم ہے، ورنہ اندیشہ یہ ہوتا ہے (جیسا بعض اداروں میں ہوا) کہ وہ ایک مخصوص اور غیر ذمہ دار گروہ کی اجارہ داری بن کر رہ جائے گا اور زندگی کی صالح تحریکیں اس پر اثر انداز نہ ہوسکیں گی۔ وہ جامعہ کے لیے اربابِ دولت سے امداد کے خواہاں ہوتے ہیں تو ان کے اندازِ سوال میں عاجزی نہیں ہوتی، گویا وہ کسی کا احسان اٹھا رہے ہیں۔ وہ دولت کے سامنے جھکنا جانتے ہی نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دولت کی نجات اور سعادت اسی میں ہے کہ وہ علم کی خدمت کرے اور نیک کاموں کے قدم چومے، ورنہ وہ اہلِ دولت کے گلے میں لعنت کا طوق ہے! ایک دفعہ ایک رئیس نے امداد کا وعدہ کر کے پورا نہیں کیا۔ رقم اچھی خاصی تھی اور اس کے نہ ملنے سے ان کے رفقائے کار کو پریشانی ہوئی اور انھوں نے مشورہ دیا کہ دوبارہ ملیے اور تقاضا کیجیے۔ لیکن ذاکر صاحب کی پیشانیِ استغنا پر شکن نہ پڑی اور انھوں نے صرف اتنا کہا کہ ایک وقت آئے گا کہ یہ لوگ خود خوشامد کریں گے اور چندہ دیں گے۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ اگر نہ دیں گے تو؟ ذاکر صاحب نے فوراً اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا، جس کی ظرافت میں بھی ہمیشہ کوئی نہ کوئی گہری حقیقت پوشیدہ ہوتی

ہے، "نہ دیں گے تو خود ان کی ہوا خیزی ہوگی۔" یہ بات نہیں کہ ان کو روپے کی قدر یا اس کی پروا نہیں۔ جن لوگوں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر اداروں کو چلایا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کے کارکنوں کو روپے کی قدر کس قدر ہوتی ہے اور کس طرح اس فکر میں ان کا دن کا آرام اور رات کی نیند جاتی رہتی ہے۔ جامعہ پر بارہا ایسے کٹھن وقت آئے ہیں جب بے زری کی پریشانی ایمان کی قوت سے ٹکرائی ہے۔ لیکن یہ مردِ مومن کبھی اس بات کے لیے تیار نہیں ہوا کہ روپے کی خاطر جامعہ کے مخصوص اور آزاد نصب العین پر آنچ آنے پائے۔ ایک دفعہ ذاکر صاحب جامعہ کی جوبلی کے سلسلے میں چندہ کرنے کے لیے رام پور گئے تھے۔ اس موقع پر انھوں نے جلسۂ عام میں جو تقریر کی اس میں (دل چسپ بات ہے نا؟) چندہ مانگنے سے زیادہ اہلِ دولت کی تعلیم مدنظر تھی اور انھیں ان کے فرائض کا احساس دلانا۔ تقریر کا بے پناہ اثر ہر کسی کے چہرے پر نظر آتا تھا۔ بلکہ کسی کسی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر جامعہ کا کام اچھا نہیں ہے، اگر چھان بین کرنے کے بعد آپ کو اس کی طرف سے اطمینان نہیں ہے تو کسی سعی و سفارش سے آپ اسے ایک پیسہ نہ دیجیے، لیکن اگر اس کی پچیس سالہ جد و جہد کو آپ نے دیکھا ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کام ملک اور قوم کے لیے مفید ہے تو جامعہ کے کارکنوں کا فرض نہیں کہ دستِ سوال آپ کے سامنے دراز کریں۔ آپ کا اپنا کام ہے کہ آپ اس کی امداد کے لیے ہاتھ بڑھائیں، جو قوم اپنے ایثار پیشہ خادموں کی قدر نہیں کرتی اور ان کے کام کو آگے بڑھانے کی تدبیریں نہیں سوچتی اسے بشارت ہو کہ اس میں اس قسم کے کام کرنے والے پیدا ہی نہ ہوں گے اور اس کی زندگی محض کاروبار، دولت آفرینی یا باہمی جنگ و جدل کے دلدل میں پھنس کر رہ جائے گی۔ عام طور پر لینے والے کا ہاتھ نیچے اور دینے والے کا ہاتھ اوپر ہوتا ہے لیکن دولت مند کی سعادت یہ ہے کہ وہ علم اور تعلیم کی امداد کرتے وقت اپنا ہاتھ نیچے رکھے اور لینے والوں کا ہاتھ اوپر رہے۔ ذاکر صاحب کے فقر میں بھی یہ انوکھی شان ہے کہ اگر خانۂ کعبہ کا دروازہ نہ کھلے تو وہ اُلٹے واپس آجاتے ہیں اور اسی کا فیضان ہے کہ اربابِ دولت اور مشاہیرِ سیاست ان سے جھک کر ملتے ہیں، انھیں مرعوب نہیں کر سکتے۔ ایک موقع پر جامعہ کا اصولِ حیات خود انھوں نے ان الفاظ میں

بیان کیا ہے:

"مستقل سرمایہ جامعہ کا نہ ہے نہ کبھی ہوگا، اس کا سرمایہ اس کے کارکنوں کی ہمت اور ایثار اور قوم کی ہمدردی ہے، ممکن ہے آپ اسے کافی نہ سمجھتے ہوں، مگر میرے نزدیک تو یہ سرمایہ لازوال سرمایہ ہے۔ اگر جامعہ ملک و قوم کی کسی ضرورت کو پورا نہیں کرتی تو وہ نہیں چلے گی اور نہ وہ اس کی مستحق ہوگی، لیکن اگر وہ کوئی مفید خدمت کر رہی ہے تو قانونِ قدرت اسے زندہ رکھے گا اور دنیا کی کوئی قوت اسے فنا نہیں کر سکے گی"

شاید ذاکر صاحب ان الفاظ کو کہتے وقت شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآن شریف کے اس اٹل اصول کی تفسیر کر رہے تھے کہ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْهَبُ جُفَآءً وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ۔

اسی قسم کی ایک دل میں چبھنے والی بات انھوں نے اس یادگار موقع پر کہی تھی جب اوکھلا میں جامعہ کی شاندار عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا جا رہا تھا (ذاکر صاحب کے ندرتِ تخیل کا ایک کرشمہ یہ تھا کہ انھوں نے سنگِ بنیاد مشاہیرِ ہند میں سے کسی سے نہیں رکھوایا بلکہ یہ عزت جامعہ کے سب سے کم سن طالب علم کے حصے میں آئی۔ دکھانا یہ مقصود تھا کہ ان کی نظر مستقبل کی طرف ہے، جس کی تعمیر اس نژادِ نو کا کام ہے جو آج مدرسوں میں تعلیم پا رہی ہے[۵]) اس موقع پر انھوں نے اپنی تقریر کے

---

۵ یہ واقعہ یکم مارچ ۳۵ء کا ہے، جب جامعہ کی پہلی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا۔ سنگِ بنیاد رکھنے سے قبل ماہنامہ جامعہ بابت ماہ جنوری ۳۵ء کے شذرات میں اس تقریب کا اعلان کرتے ہوئے لکھا گیا تھا "اس مبارک رسم کو انجام دینے کے لیے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا گیا ہے جو نہ فرماں رواؤں میں ہے، نہ ارکانِ سلطنت میں، نہ صاحبانِ دولت میں، نہ اربابِ علم میں، نہ رہبرانِ ملک میں، نہ اکابرِ قوم میں، جو کچھ نہیں ہے، مگر سب کچھ ہو سکتا ہے۔ یہ اس نژادِ نو کا نمائندہ ہے، جس سے علامہ اقبال نے (باقی اگلے صفحے پر)

دوران میں جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا (الفاظ کی صحت کی ضمانت نہیں کرتا، لیکن مفہوم یہی تھا) بڑی بڑی شاندار عمارتوں کے بنانے میں ہمیشہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں تعلیم کی روح ان میں اسیر ہو کر نہ رہ جائے اور سازوسامان کی فراوانی تعلیم گاہ کے نصب العین کو دبا کر فنا نہ کردے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جامعہ کو چھوٹی چھوٹی کچی عمارتوں اور جھونپڑیوں میں شروع کیا گیا تھا اور اس کے کارکنوں کی ہمیشہ کوشش رہی کہ اس مادی بے سروسامانی کی حالت میں اس کی آزادی اور بلند نظری کو قائم رکھا جائے۔ اگر ان نئی عمارتوں کے بننے سے یہ اندیشہ ہو کہ جامعہ اپنے بلند نصب العین پر قائم نہ رہ سکے گی تو میں دعا کروں گا کہ یہ عمارتیں تیار ہونے سے پہلے ہی برباد ہو کر زمین میں مل جائیں۔" جس زمانے میں افراد کی عظمت کا اندازہ ان کے لباس اور نمائشی شان سے اور درسگاہوں کی حیثیت کا اندازہ ان کی عمارتوں اور سازوسامان سے کیا جاتا ہو، اس قسم کا خیال غیر معمولی صاحبِ نظر انسان کے دماغ میں ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ جس درسگاہ کے کارکنوں کو اس اندیشے کا احساس ہو اور جس کا راہبر ذاکر حسین جیسا شخص ہو، اس کو یہ مصیبت پیش نہیں آسکتی۔ ایک درسگاہ میں وہی روح، وہی جذبہ اور وہی نظر کام کرتی ہے جو اس کے کارکنوں کے دل اور دماغ میں جلوہ گر ہے۔ ذاکر صاحب کے حریمِ ذات میں جو چراغ روشن ہے وہ صرف جامعہ ہی کو نہیں بلکہ تمام ملک اور قوم کو روشن رکھنے کی امنگ اور صلاحیت رکھتا ہے۔

ذاکر صاحب کے دل میں عالموں اور علم کے خادموں کی بہت قدر ہے وہ اس بات کو گوارا نہیں کرسکتے کہ درسگاہوں میں انتظامی جماعت یا اہلِ ثروت ان کے ساتھ تنخواہ یاب ملازموں کا سا سلوک کریں۔ ایسا کرنا نہ صرف ان کی شان کے خلاف ہے بلکہ تعلیم کے کام میں بھی اس سے خلل پڑتا ہے، کیوں کہ کارکنوں کو جس اطمینانِ خاطر، آزادی اور عزتِ نفس کے احساس کی ضرورت ہوتی ہے، وہ انھیں میسّر

(صفحہ ۷۲ کا بقیہ) جاوید نامے میں خطاب کیا ہے، یہ جامعہ کا سب سے چھوٹا بچہ ہے۔ اربابِ نظر اس انتخاب کی داد دیں گے اور یہ تسلیم کریں گے کہ یہ مستقبل کا مالک ہم حال کے غلاموں سے اس منصب کے لیے کہیں زیادہ موزوں ہے۔" (عبداللطیف اعظمی)

نہیں آتا۔ ان کا عقیدہ ہے درسگاہوں کا نظم ونسق زیادہ تر اس کے اُستادوں کے
ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی عمدہ انتظامی جماعت ہو تو اسے اپنے معلمین کے ساتھ
وہی سلوک کرنا چاہیے جو معزز شریکِ کار کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ انھوں نے
ہر موقع پر ہمیشہ اس بارے میں اسٹاف کے جائز حقوق کی علم برداری کی اور جہاں
کہیں خمارِ دولت یا خمارِ قوت کے زیرِ اثر اساتذہ کے ساتھ شایانِ شان سلوک نہیں ہوا،
انھوں نے نہایت دلیری کے ساتھ ان کی حمایت میں آواز بلند کی۔ وہ چاہتے ہیں کہ
تعلیم گاہوں میں ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس میں اُستاد فکرِ معاش سے
بے نیاز ہوں (گو انھیں اور اہلِ جامعہ کو اپنے ایثار کی وجہ سے یہ بات کبھی نصیب
نہیں ہوئی) اپنا کام وقت اور توجہ تعلیم وتعلم میں صرف کرسکیں اور زندگی کے دوسرے
شعبوں میں ترقی کرنے کے لیے جس تگ ودو اور ریشہ دوانی کی ضرورت ہوتی ہے
اس سے محفوظ رہیں۔ کس قدر مختلف ہے یہ تصور اس فضا سے جو آج کل عام طور پر
ہمارے بیشتر مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پیدا ہوگئی ہے۔ جہاں ذاتی
اغراض ومقاصد، ذاتی ترقی اور تنخواہ، ذاتی اثر ورسوخ کی کشمکش میں تعلیم کی روح
پنپ نہیں پاتی ہے۔ جامعہ کو جو کامیابی اور نیک نامی نصیب ہوئی اس کا ایک
بڑا سبب یہ تھا کہ اس میں ذاکر صاحب نے قابل، مستعد اور پرخلوص کارکنوں کی
ایک ایسی جماعت اکٹھی کی تھی جس کے ساتھ وہ احترام، خلوص اور رفاقت کا برتاؤ
کرتے تھے اور جس کو ان کی ذات کے ساتھ عقیدت تھی۔ ان کی ذاتی کشش کا فیض
ہے کہ وہاں مدت تک بہت سے ایسے معلم کام کرتے رہے جن کو باہر بہترین مواقع
مل سکتے تھے لیکن ان کے دل میں انھیں قدروں کی لگن تھی اور اسی عشق کا چراغ
روشن تھا جو ذاکر صاحب کے سینے میں فروزاں ہے۔ اسی لیے وہ جامعہ کو چھوڑ کر جانے
کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ انھیں کبھی معاش کی طرف سے اطمینان نصیب نہیں ہوا،
لیکن اس کے بدلے انھیں اعتماد، رفاقت، عین پسندی کی دولت میسر تھی جو
بعض مصلحت ناشناس لوگوں کے نزدیک مالی فراغت سے زیادہ قابلِ قدر چیز ہے۔
اگر ذاکر صاحب کی شخصی کشش ان کے دلوں کو جامعہ کی طرف نہ کھینچتی تو اس درسگاہ
کا بھی وہی حشر ہوتا جو ان درجنوں قومی درسگاہوں کا ہوا جو ۱۹۲۰ء کی سیاسی تحریک

کے بعد قائم ہوئی تھیں۔ قوم کے جوش اور ولولے نے ان کو وجود بخشا تھا اور قوم ہی کی عظمت اور استقلال کی کمی نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ ۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب نے جامعہ کا کام اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔ اس وقت وہ تقریباً نیم جان تھی اور اس کے بانیوں اور کارکنوں تک کے ذہن میں اس کا کوئی واضح تصوّر اور نصب العین نہ تھا۔ بعض اس کو ایک تعلیمی درسگاہ بنانا چاہتے تھے، بعض کی خواہش تھی کہ اس میں سیاسی کارکنوں کی تربیت کی جائے۔ لیکن جہاں تک اس کی مالی اور انتظامی ذمّے داریوں کا تعلق ہے کوئی شخص بھی (سوائے دو تین بندگانِ خدا کے جنھوں نے وقتاً فوقتاً اس کی مدد کی) اس بوجھ کو اٹھانے کے لیے تیار نہ تھا، بلکہ حکیم اجمل خاں کے بعد ایک وقت آزمائش کا ایسا آیا تھا جب تمام عمائدینِ ملک کی یہ رائے تھی کہ اس ادارے کے چلنے کا امکان نہیں ہے، اس کو بند کر دینا چاہیے۔ لیکن ذاکر صاحب کی اولوالعزمی اور بلند نظری اور ان کے ساتھیوں کے ایثار نے اس شکست خوردہ رائے کو نہیں مانا[1] اور گاندھی جی کی

---

[1] حکیم اجمل خاں کا انتقال ہوا تو جامعہ ۵۵ ہزار کی مقروض تھی، جس کے ادا کرنے کی بہ ظاہر کوئی شکل نہ تھی۔ اس لیے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری صاحب کو ۹ر جولائی ۲۸ء کو ایک خط میں لکھا کہ "مسئلے کی اہمیت اور نزاکت کو دیکھتے ہوئے اسے جلد از جلد حل کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے حل کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو امنائے جامعہ (ٹرسٹیز) غیر معمولی سعی و کوشش سے مطلوبہ رقم فراہم کر دیں یا اگر وہ نہ کر سکیں تو اپنی طرف سے جامعہ کو بند کر دیں اور اس کے کام سے دست کش ہو جائیں۔ لیکن اس کو بند کرنے سے پہلے قوم کو اس بات کا موقع دیں کہ وہ اگر اس کام کو مفید سمجھتی ہے تو کوئی اور جماعت اسے اپنے ہاتھ میں لے لے اور اسے چلائے۔ جامعہ ملّیہ کے اساتذہ میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہیں جنھوں نے اپنی عمر قومی تعلیم کے کام میں وقف کرنے کا تہیّہ کر لیا ہے، یہ لوگ شاید ملک کے با اثر اور ملک کے دولت مند اشخاص میں کچھ ایسے لوگ تلاش کر سکیں جو ان کے ارادوں سے محض ہمدردی نہ رکھتے ہوں بلکہ ان کی تکمیل میں عملی حصّہ لینے کو بھی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ہمت افزائی کے طفیل خود اپنے بل بوتے پر وہ نہ صرف سخت کڑیاں جھیل گئے، بلکہ جامعہ کو اس مقام پر پہنچا دیا جہاں اس نے ہند اور بیرونِ ہند کے اہل الرائے ماہرینِ تعلیم سے خراجِ تحسین وصول کیا۔

کارکنانِ جامعہ کی نظر میں جامعہ کا تعلیمی تصور اور مسلمانوں کی قومی زندگی میں اس کا وظیفہ کیا ہے؟ اس سوال کا مفصل اور واضح جواب دینا انھیں کا کام ہے۔ میں تو صرف ایک جھلک جامعہ کے اس نصب العین کی دکھانا چاہتا ہوں جو ذاکر صاحب کے ذہن میں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ علی گڑھ کی تعلیمی تحریک نے مسلمانوں کی بہت بڑی خدمت کی اور ان کے متوسط اور اعلیٰ طبقے کو نئی تعلیم اور علوم جدیدہ کی طرف مائل کر کے ان کو ازمنۂ متوسط کے جھٹپٹے سے نکالا اور عصرِ حاضر کا راستہ دکھایا۔ لیکن سرسید کے وقت سے اب تک زمانہ بہت بدل گیا ہے اور تعلیم اور تہذیب، سیاست اور معاشرت کے مسائل کو نئے انداز اور نئی تفسیر کی ضرورت ہے۔ اُس وقت تعلیم کا مسئلہ ایک محدود مسئلہ سمجھا جاتا تھا یعنی اعلیٰ طبقے کے افراد کی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کر دیجیے، ان کو اچھی نوکریاں دلا دیجیے، انگریزی نصاب اور مغربی علوم کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

تیار ہوں۔ امنائے جامعہ اس کام کو ان لوگوں کے ہاتھوں میں دے دے تاکہ وہ اسے اپنی خواہش اور بساط کے مطابق جہاں تک چلا سکیں چلائیں۔" امیرِ جامعہ ڈاکٹر انصاری نے یہ خط امنائے جامعہ کو بھیج دیا۔ اسی کے ساتھ ذاکر صاحب نے ایک خط اپنے ساتھیوں کو بھی لکھا کہ "جامعہ مقروض ہے، روپیہ مفقود ہے، جامعہ کو بند کرنے کا سوال درپیش ہے، آپ اس کام کو یا اس کے کسی حصے کو بچانا چاہتے ہیں یا نہیں۔ کام کو جاری اسی وقت رکھا جا سکتا ہے جب کہ آپ ہر طرح کی مصیبتیں جھیلنے اور مشکلات سہنے کے لیے تیار ہوں۔" امنا میں سے اکثر حضرات نے امیرِ جامعہ کو کوئی جواب نہیں دیا۔ جس نے جواب دیا تو وہ چلانے کے حق میں نہیں تھا۔ جامعہ کے استادوں اور کارکنوں نے شیخ الجامعہ کے جواب میں لکھا کہ ہم جامعہ کو ہر حالت اور ہر قیمت پر چلانے کے لیے تیار ہیں۔ بالآخر طے پایا کہ جامعہ کو اس کے کارکنوں کے سپرد کر دیا جائے۔ (عبداللطیف اعظمی)

تعلیم دینیات کی دے دیجیے اور بس۔ دین و دنیا دونوں کے مسئلوں کا حل ہو جائے گا۔
لیکن عصر حاضر کے مسائل اس سے بالکل مختلف ہیں۔ اب کسی خاص جماعت کی تعلیم اور تہذیب کا سوال نہیں، عوام کی تعلیم کا سوال ہے، اب چند تعلیم یافتہ لوگوں کو نوکریاں دلانے کا سوال نہیں بلکہ قوم کے تمام افراد کی علمی، عملی اور فنی صلاحیتوں کی تربیت کرکے انھیں افرادِ کاسبہ بنانا ہے۔ زندگی کے تقاضے اس قدر شدید اور اس کا مقابلہ اس قدر سخت ہو گیا ہے کہ محض امتحان پاس کر لینے سے صلاحیت عمل کی سند نہیں ملتی۔ ضرورت ہے کہ ایک بہت بہتر اور مناسب تعلیم کے ذریعے ان کی ذہنی تربیت کا انتظام کیا جائے؛ درسی تعلیم کی کچّی پکّی عمارت بنا کر اس پر دینیات کی سفیدی کا ایک ہاتھ پھیر دینے سے کام نہیں چلے گا، بلکہ دنیا کو "ادب خوردہ دین" بنا کر زندگی کی گہرائیوں سے نصاب تعلیم کے لیے مواد فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔
ماضی کی فرسودہ روایات اور قدامت پرستی کے آثار نے اس کھلی ہوئی حقیقت کو اس بیّن انقلاب کی نظروں سے اوجھل کر رکھا تھا، لیکن ذاکر صاحب کی تیز اور نکتہ رس نگاہ نے اس کو بے نقاب دیکھا اور اس کی روشنی میں انھوں نے اپنے تعلیمی تصورات کو مرتب کیا۔ ان کی درس گاہ ایک معمل یا تجربہ گاہ ہے، جہاں عوام بالخصوص عام مسلمانوں کے لیے صحیح اور اچھی تعلیم کا پیکر تیار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ استاد، طالب علم اور منتظمین سب مل کر آزادی کی فضا میں تعلیم کے حقیقی مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں اور یہ اس وقت ممکن ہے جب وہ ان بندشوں اور ذہنی پابندیوں سے آزاد ہوں۔ جس میں ہندوستانی تعلیم نے گذشتہ سو سال میں نشوونما پائی ہے اور جن کی وجہ سے استادوں کی نظر امتحان اور نتائج کی بھول بھلیاں میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ طلباء کا تخیل حصولِ ملازمت کے چکّر سے باہر نہیں نکلتا اور منتظمین افسرانِ محکمہ کو خوش رکھنا اور ان سے مالی امداد حاصل کرنا اپنا مقصود اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے انگریزی حکومت کے دور میں جامعہ کی آزادی کو قائم رکھنے کے لیے پہلا بنیادی اصول یہ قائم کیا کہ اس کے لیے نہ حکومت کی امداد قبول کریں نہ اس کا چارٹر، جس کے جلو میں مختلف قسم کی پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ ان کی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے فارغ التحصیل طلباء کے لیے بقول شخصے چوری کا کھٹکا، تک نہ رہا اور وہ علم کو علم کی

اور تعلیم کو تعلیم کی خاطر حاصل کرنے کا مطلب سمجھنے لگے۔ دوسری طرف استادوں کو یہ موقع ملا کہ تعلیم کے ان پہلوؤں پر زور دیں جو قومی سیرت کی تعمیر کرتے اور عوام کی زندگی کو بناتے ہیں۔

اسی طرح قومی تعلیم کے میدان میں ذاکر صاحب کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اس کو ایک محدود اور روایتی تنگ نالے سے نکال کر زندگی کے سمندر میں لائے تاکہ وہ ان تحریکوں سے متاثر ہو سکے جو زندگی کی گہرائیوں سے پیدا ہو کر اس کو نئے تقاضوں سے مالامال کرتی رہتی ہیں۔ نظری طور پر ہندوستان میں دوسرے لوگ بھی اس اصول کی تبلیغ کر رہے تھے، لیکن زبانی اور تحریری تلقین کی سہل پسندی کی بجائے ذاکر صاحب نے اپنے لیے عمل کا دشوار گزار راستہ پسند کیا۔ اسی لیے میں نے کئی سال ہوئے اپنی ایک کتاب "مستقبل کے مدرسے" کو ذاکر صاحب کے نام ان الفاظ کے ساتھ معنون کیا تھا: "ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے نام جو خاموشی کے ساتھ مدرسۂ مستقبل کی تشکیل کر رہے ہیں، جب کہ دوسرے لوگ زیادہ تر اس کے متعلق تقریریں کرتے یا مضمون لکھتے ہیں۔"

ذاکر صاحب نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ جامعہ ملیہ کو قومی تعلیم کے لیے ایک نمونے کی درس گاہ بنائیں جہاں ایک سازگار ماحول میں مختلف قسم کے تعلیمی تجربے کیے جائیں اور ان کی روشنی میں قومی تعلیم کے اصول اور مقاصد اور اس کے نصاب اور منہاج کا تعین کیا جائے۔ اسی وجہ سے جامعہ کی توسیع کی جو اسکیم ان کے پیشِ نظر تھی، اس میں مختلف درجے کی درس گاہوں کے لیے گنجائش رکھی گئی تھی، مثلاً ایک چھوٹے بچوں کا اسکول، ایک مثالی بنیادی مدرسہ، ایک ثانوی مدرسہ جس میں متنوع تعلیمی نصاب رائج کیا جائے، ایک ٹکنیکل اسکول، ایک کالج، ایک تصنیف و تالیف کا ادارہ، چند تحقیقاتی ادارے جو ملک کی تہذیب کے مختلف عناصر کا ماہرانہ مطالعہ کریں۔

یہ تو ہوا ان کی جامعہ کا نصب العین، لیکن جب تک کسی تعلیمی نصب العین کو قوم اور ملت کے ساتھ وابستہ نہ کیا جائے اس وقت تک اس میں معنویت، اثر اور گہرائی پیدا نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس بحث کے ساتھ ساتھ قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کے ذہن میں مسلمانوں کی سیاست کا کیا تصور ہے اور وہ ہندوستان میں ان کے لیے

کس مقام کی توقع رکھتے ہیں ؟ اس نازک اور ناروادار دور میں جب لوگوں نے اختلاف رائے کو مخالفت اور مخالفت کو جرم اور غداری سمجھ لیا ہے، ذاکر صاحب نے جس جرأت کے ساتھ اپنے خیال اور عقیدے کی علم برداری کی وہ بجائے خود ایک دلچسپ نفسیاتی مطالعہ ہے، جس کا یہاں موقع نہیں۔ اکثر جب کسی ملک میں سیاسی سیلاب آتا ہے تو ہر شخص سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی ہی جماعت کے وقتی خیالات اور جذبات اور تعصبات کو ایک اٹل حقیقت مان کر ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ چنانچہ جس وقت ہندو اور مسلمان، چپ و راست کی سیاسی پارٹیاں، انگریز دوست اور انگریز دشمن سب ہی اس نامبارک ذہنیت میں گرفتار تھے، ذاکر صاحب نے اپنا سوچا سمجھا راستہ نہیں بدلا اور مخالفت کی آندھیاں ان کے عقیدے کا چراغ نہیں بجھا سکیں۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

یہ عقیدہ کیا ہے ؟ ذاکر صاحب کو اس تہذیب و تمدن سے گہری اور سچی محبت ہے جو ہندوستان میں اسلام کے حیات بخش اثر سے پیدا ہوئی اور ان کے دل میں اس فلسفۂ حیات کا، اس علم و ادب کا، اس معاشرتی نظام کا زبردست احترام ہے جو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں اس تہذیب و تمدن اور اس معاشرت اور فلسفے کے اصولوں اور قدروں کو پرکھنے اور ان کی مبصرانہ تفسیر کرنے کی غیر معمولی صلاحیت بھی ہے۔ وہ ایک صاحبِ نظر مفکر کی طرح لفظوں کی سطح سے نیچے اتر کر معنی کی گہرائیوں تک پہنچ جاتے ہیں، ان کے اسلامی تصورِ حیات میں جہاں ایک سچے اور راسخ مسلمان کا عقیدہ جھلکتا ہے، وہاں اس میں عصرِ حاضر کی تحریکوں اور تقاضوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ عقیدہ ان کو بتاتا ہے کہ اسلام کے بنیادی اصول چودھویں صدی ہجری میں بھی ایسے ہی سچے اور قابلِ عمل ہیں جیسے وہ پہلی صدی میں تھے۔ لیکن عقل اور تجربہ اور حالاتِ حاضرہ کا گہرا مطالعہ انھیں یہ بھی بتاتا ہے کہ چودھویں صدی میں ان اصولوں کا اعلان اور ان کی تفسیر چودھویں صدی کے مسائل اور ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر کرنی

چاہیے۔ اس وجہ سے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل میں وہ "ترقی پسند" ہیں، لیکن یہ وہ "ترقی پسندی" نہیں جو مستقبل کے لیے بے صبری میں ماضی کے سرمائے کو ٹھکرا دیتی ہے، بلکہ یہ تو جرأت کے ساتھ ماضی اور حال دونوں کا محاسبہ کرتی ہے اور اپنی تمدنی میراث کے بہترین عناصر لے کر ان سے مستقبل کی تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ اسی راہ وسط کو اختیار کرنے کی وجہ سے ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ جامعہ کو کسی خاص سیاسی پارٹی کے ساتھ وابستہ کریں اور شاید کوئی منظم سیاسی پارٹی ان کو اطمینان کے ساتھ ہضم بھی نہیں کر سکتی۔ پارٹی تنقید اور انفرادیت کی بجائے اطاعت اور پیروی چاہتی ہے، اسے حق سے زیادہ طاقت کی تلاش ہوتی ہے اور بدقسمتی سے ذاکر صاحب کی طبع ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ حق کو طاقت پر ترجیح دیتے ہیں، بلکہ یہ ستم کرتے ہیں کہ حق ہی کو طاقت سمجھتے ہیں۔

ان کا سیاسی عقیدہ ہے کہ قوم کی ترقی کے لیے تمام جماعتوں کو اپنی مخصوص صلاحیتوں کی مکمل نشوونما کا موقع ملنا چاہیے۔ انھیں کی ہم آہنگ تربیت میں قومی فلاح کا راز پوشیدہ ہے۔ ہندوستانی تہذیب ایک مشترک کارنامہ ہے، اس کی نشوونما میں مختلف جماعتیں اور قومیں اور مختلف نسلوں اور مذہبوں کے لوگ شریک ہیں۔ اس اجتماعی کارنامے میں، جو ایک ہزار برس کے میل جول کا نتیجہ ہے مسلمانوں نے بہت نمایاں اور قابلِ قدر حصہ لیا ہے اور ذاکر صاحب اس مشترک ورثہ کو قائم رکھنے اور مالا مال کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے لیے یہ پوزیشن ہرگز شایانِ شان نہیں کہ وہ اپنی گزشتہ تاریخ اور روایات سے بے تعلقی اختیار کر لیں اور جس ملک میں انھیں جینا اور مرنا ہے اس کی سماجی اور سیاسی خدمت میں پیش پیش نہ رہیں۔ دنیا میں جہاں کہیں ظلم ہے، بے انصافی ہے، جہالت ہے، توہمات ہیں، انسانوں میں نسل و رنگ کا امتیاز رائج ہے، اس کو دور کرنا مسلمان کا مذہبی اور ملّی فریضہ ہے۔ خدمت اس کی سب سے بڑی سعادت ہے اور اس خدمت میں ہندو اور مسلمان کی، مشرق اور مغرب کی، سیاہ و سفید کی تمیز کوئی معنی نہیں رکھتی، اسی لیے انھوں نے جامعہ کی تعلیم کا مقصد اعلیٰ بنی نوع انسان کی خدمت قرار دیا ہے۔ اگر جامعہ کے صدر دروازے پر کوئی حسب حال موٹو لگانا ہو تو میرے خیال میں اس کے

نصب العین کی بہترین توضیح اقبال کا یہ شعر ہوگا :

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

ذاکر صاحب کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ مسلمان ہندوستان کے مستقبل میں ایک نمایاں اور قابلِ فخر حصّہ لیں اور اس مقصد کے لیے اپنے مذہب اور تہذیب و تمدّن کے بہترین عناصر کو نہ صرف اپنی قومی خودی میں جذب کریں بلکہ ان کے ذریعہ ہندوستانی تہذیب کو بھی مالامال کریں۔ مانا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کمزور ہے دگو میں سمجھتا ہوں کہ جو جماعت ذاکر حسین پیدا کر سکتی ہے، اس کی خاک میں بہت بجلیاں پوشیدہ ہیں) لیکن اسلام کے کیسے میں اخلاق اور عمل کے بے نظیر نمونے ہیں، جن کی اس دنیا کو، جو ظلم و جور سے بھر گئی ہے، بہت ضرورت ہے! یوں تو ہر جماعت کا فرض ہے کہ وہ اپنی روشنی سے دنیا کو منوّر کرے۔ لیکن مسلمان پر جو دنیا میں حق کے مبلغ ہونے کا دعوی کرتا ہے، یہ فرض خاص طور پر عاید ہوتا ہے۔ اسی طرح ذاکر صاحب چاہتے ہیں کہ تمام ہندوستانی انصاف اور انسانیت کی اس جنگ میں کھلے دل سے حصّہ لیں جو ہر ملک اور قوم میں مختلف شکلوں اور اندازمیں ہو رہی ہے۔ وہ تنگ نظر قومیت، مذہبی ناروا داری، نسلی تعصب، جغرافیائی حد بندیوں غرض ان تمام چیزوں سے بیزار ہیں جو انسان کو انسان سے جدا اور ان کی وحدت کو پاش پاش کرتی ہیں۔ افراد اور جماعتوں میں جو مختلف قسم کے تاریخی اور تمدّنی فرق ہیں وہ ایک اچھی چیز ہے، کیوں کہ دنیا کی گوناگونی انھیں سے عبارت ہے، لیکن جب اختلاف، مخالفت اور تعصب کی شکل اختیار کر لیں تو فتنہ کا باعث بن جاتے ہیں جو قتل سے بدتر ہے، اسی لیے ان کے نزدیک رواداری اور انصاف کی تلقین اچھی تعلیم کا سب سے اہم مقصد ہے۔ ذاکر صاحب ہی کے الفاظ میں اس فرض کی پُرجوش تفسیر سنیے جو اس کے مذہب نے مسلمان کو سونپا ہے۔

اگر ہم مسلمان کی حیثیت سے حریت خواہ ہونے پر مجبور ہیں، اگر ہم دنیا سے ہر قسم کی غلامی کو مٹانے پر مامور ہیں، اگر ہم انسانیت کی ایسی سیاسی تنظیم چاہتے ہیں، جس میں امیر اور غریب کا فرق

انسانوں کی اکثریت کو انسانیت کے شرف ہی سے محروم نہ کر دے،
اگر ہم نسل اور رنگ کے تعصبات کو مٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں تو ان
فرائض کو پورا کرنے کا موقع سب سے پہلے اپنے پیارے وطن میں ہے،
جس کی مٹی سے ہم بنے ہیں اور جس کی مٹی میں ہم واپس جائیں گے...
ہمارے نوجوان روٹی بھی کمائیں گے اور نوکریاں بھی کریں گے،
پر ان کی نوکری خالی پیٹ کی چاکری نہ ہوگی، بلکہ اپنے دین کی اور
وطن کی خدمت ہوگی، جس سے ان کے پیٹ کی آگ ہی نہ بجھے گی۔
دل اور روح کی کلی بھی کھلے گی، یہ اپنے نصب العین ہی کی وجہ سے
اپنے دیس کی، کہ کبھی دنیا اسے جنّت نشان کہتی تھی، سیوا کریں گے
اور ایسا بنائیں گے کہ پھر اس کے بھوکے، بیمار، بے کس، بے امید
غلام باسیوں کے سامنے انھیں اپنے رحمٰن و رحیم، رزّاق و کریم،
حی و قیوم خدا کا نام لیتے وقت شرم سے سر نہ جھکانا پڑے گا کہ
انھیں بعض کی زیادتیوں اور بعض کی کوتاہیوں نے بعض کے ظلم
اور بعض کی غفلت نے آج اس حال کو پہنچادیا ہے کہ ان کا وجود
محدود نگاہوں کو اس کی شانِ ربوبیت پر ایک دھبّہ سا معلوم
ہوتا ہے۔)

ان الفاظ میں نہ صرف جامعہ ملیہ بلکہ تمام اچھے اداروں کے نصب العین کی
روشن جھلک نظر آتی ہے۔

ذاکر صاحب کے نزدیک وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اس جذبۂ خدمت کو محدود کرکے
مسلمانوں کے اسلامی اور پیغمبرانہ فرض کی حد بندی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے عمل اور
اصول دونوں کا سرچشمہ قرآن شریف کی یہ آیت ہے کہ "تم میں ایک ایسی اُمّت
وسط ہونی چاہیے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، انھیں نیک کام کرنے کی ترغیب
دے اور بُرے کاموں سے روکے" یہ بڑا مشکل کام ہے، کیونکہ نیکی کی طرف بلانے
اور بدی کو روکنے میں اکثر دوستوں اور عزیزوں اور جماعت کی مخالفت مول لینی پڑتی
ہے، لیکن اسلامی زندگی اور انسانی شرف دونوں کا تقاضا یہی ہے، اور ذاکر صاحب

کو قدرت نے جرأت اور دشوار پسندی کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔

(ذاکر صاحب چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی مختلف جماعتیں اپنی مخصوص انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے، ایک منظم، رواداراور فراخ دل قومیت کی بنیاد ڈالیں اور اپنے اپنے مخصوص تمدنی ورثے اور صلاحیتوں سے ہندوستانی تہذیب و تمدن کو فروغ بخشیں، اسی لیے انھوں نے جامعہ میں بیک وقت قومیت اور اسلامیت کی قدروں کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ بے شک غلط قومیت اور اسلام ایک دوسرے کے نقیض ہیں، لیکن سچی قومیت میں جو وطن کی محبت اور اس کی خدمت کو ایمان کا جزو سمجھتی ہے۔ (حُبّ الوطن من الایمان) اور مذہب کی حقیقی روح میں کوئی بنیادی تناقض نہیں۔ انھوں نے عمل سے اس بات کو ثابت کر دکھایا ہے کہ بہ یک وقت ایک اچھا مسلمان اور اچھا ہندوستانی نہ صرف ممکن ہے بلکہ یہ دونوں چیزیں دراصل ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں، جو شخص واقعاً ایک اچھا مسلمان ہوگا اس میں یقیناً وہ صفات ہونی چاہئیں جو ایک اچھے شہری کے لیے ضروری ہیں۔ وہ نہ غلط اور تنگ نظر قومیت کے لیے اپنے مذہب کا سودا کرے گا، نہ مذہب کو اپنی تنگ نظری اور ناروا داری کی آڑ بنا کر تاریخی ارتقا کے سلسلے میں حارج ہوگا۔

لیکن جہاں وہ ایک طرف اس بات کے مخالف ہیں کہ مسلمان خود کو قومی زندگی کے دھارے سے الگ کرلیں، وہاں وہ سختی اور خلوص کے ساتھ اس اندھی تحریک پر بھی احتساب اور تنقید کرتے ہیں جو ہندوستان کی زندگی اور تہذیب میں سے ان قابلِ قدر عناصر کو نکال دینا چاہتی ہے جو مسلمانوں نے گزشتہ ہزار برس میں ہندوستان کو بخشے ہیں۔ میں نے انھیں مسلمانوں کے مجمع میں وہ سچّی اور کڑوی باتیں کہتے سُنا ہے جن سے ہر دل عزیزی کے بھوکے لیڈر جان بوجھ کر پرہیز کرتے ہیں۔ میں نے انھیں افتراق اور اختلاف کی پرورش میں اتحاد اور ہم آہنگی کی نامعقول تائید کرتے دیکھا ہے، جس کی وجہ سے شاید بعض کوتاہ بیں اور سطحی لوگ جو عوام کی کمزوریوں کے ساتھ کھیل کر ان کے جذبات سے فائدہ اٹھانے کے عادی ہیں، یہ سمجھتے رہے کہ ذاکر صاحب کے دل میں مسلمانوں کے لیے وہ تڑپ نہیں جو خود ان بزرگانِ ملت کے دل میں ہے۔ لیکن وہی ذاکر جب کسی غیر مسلم مجمع کو خطاب کرتا ہے یا کسی غیر مسلم لیڈر

سے گفتگو کرتا ہے تو اسے اپنے مسلمان ہونے پر جو فخر ہے وہ اس کی ہر بات اور ہر انداز سے ٹپکتا ہے اور وہ ان سے پُرزور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی باعزت حیثیت کو تسلیم کریں۔

کاشی وِدّیا پیٹھ میں تقسیم اسناد کا جلسہ[۱] ہے، جس میں تقریباً تمام مجمع ہندو حضرات کا ہے، اس جلسے میں خطبہ دینے کے لیے ذاکر صاحب کو مدعو کیا گیا ہے، یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں اس زمانے میں بہت سے مسلمان جانے سے بھی کتراتے، کیوں کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ ایسے موقع پر کیا کہنا چاہیے اور بعض شاید وہاں پہنچ کر اپنی اسلامی ذہنیت بالارادہ پوشیدہ رکھتے، کیوں کہ انھیں یہ چیز غیر متعلق معلوم ہوتی۔ لیکن ایک بندۂ خدا ایسا بھی نکلا جو

کہتا ہے وہی بات سمجھتا ہے جسے حق
وہ ابلہِ مسجد ہے نہ تہذیب کا فرزند

چنانچہ اس اہم جلسے میں انھوں نے ایک غیر مسلم مجمع کو مسلمانوں کا نقطۂ نظر ان واضح اور بے باک لیکن دل نشین لفظوں میں سمجھایا۔

"آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور ویس کے مستقبل کا صحیح تصوّر نہ قائم کرسکنے کو دخل ہے، وہاں اس شدید شبہہ کا بھی بڑا حصّہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں بھی یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کو ادا کرنے پر تیار نہیں، اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی، خود ہندوستان کا تمدّن پستی میں کہاں سے کہاں

---

[۱] منعقدہ بنارس مورخہ ۱۴ اگست ۳۵ء (لطیف اعظمی)

پہنچ جائے گا)

گرچہ مثلِ غنچہ دل گیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

—— یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمان ہندوستانی اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات اور اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملی وجود کو خود اپنے لیے ہی بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندوستانی قومیت کے لیے نہایت بیش قیمت جانتے ہیں اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کیے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں ہندوستانی قوم کے ساتھ بھی سخت خیانت سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا دین کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے، وہ ہندوستانی قوم کا جزو بننے پر فخر کرتے ہیں۔ مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارا نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔ ان کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی اور نہ کوئی مسلمان انھیں ہندی ہونے پر شرمائے، نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے، ہندوستان میں ان کا دین ملک سے بے تعلقی کا عذر نہ ہو، بلکہ خدمت کی ذمے داری ان پر ڈالے۔ وہ ان کے لیے عیب نہ ہو بلکہ امتیاز۔"

لیکن جب وہ مسلمانوں کی کسی جماعت کو مخاطب کرتے ہیں تو ان کا یہ شعار نہیں کہ جھوٹی تعریفوں اور لوریوں سے ان کی خود پسندی کو بیدار کرکے ان کی قوتِ احتساب کو سُلا دیں یا دوسروں کی عیب جوئی کرکے ان کی انانیت کو جھوٹا استحکام بخشیں، وہی بیدار مغزی اور روشن ضمیری جو اسلام کی حیات بخش قدروں کو بے نقاب دیکھتی ہے مسلمانوں کی چھپی اور کھلی ہوئی کمزوریوں کا محاسبہ بھی کرتی ہے اور انھیں اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ ان کے موجودہ مقام اور ان کے نصب العین میں کتنا زبردست فاصلہ ہے، لہٰذا اس خطبے کے بھی یہ جملے قابلِ غور ہیں جو ذاکر صاحب نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ علی گڑھ ۱۹۴۶ء میں دیا تھا۔ یہاں مخاطب تمام تر مسلمان ہیں اور انھیں کی ثانوی تعلیم کا مسئلہ پیش ہے۔

—— "ہم نے جو تعلیمی ادارے خاص مسلمانوں کے لیے بنائے ہیں ان کو دیکھیے، ہم کس معنی میں انھیں اسلامی ادارے بتاتے ہیں....

کیا اسلام کی مذہبیت ایسی ہی رسمی اور خارجی چیز ہے جیسی کہ ان مدرسوں کے عمل سے ظاہر ہوتی ہے ؟ کیا اسلام کی سیاست ایسی ہی عافیت پسندی اور دریوزہ گری کی سیاست ہے ؟ کیا شخصی مفاد کی خاطر اسلام اپنے ماحول اور اپنی جماعت کے مقاصد کی طرف سے ایسی ہی بے اعتنائی سکھاتا ہے جیسی کہ ہم نے اپنی تعلیمی کوششوں سے پیدا کی ہے ؟ نہیں اور ہزار بار نہیں! ..... ایک ایسی دنیا جو نسل، وطن اور دولت کی تفریقوں سے انسانیت کے لیے جہنم بن گئی ہے، پھر ہم سے اس حقیقی عدل و مساوات کی فرماں روائی کا پیام سُننے اور اس کا عملی تجربہ دیکھنے کے لیے بے تاب ہے جو ایک نبی امّی نے دنیا کو سُنایا اور دکھایا تھا۔ کیا ملّت اسلامی اس تقدیر، اس موقع اور اس ذمہ داری کو دو روٹیوں کے بدلے بیچ دے گی ؟..... ایک بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کو اس ملک میں ایک خود دار اور آزاد جماعت کی طرح زندہ رہنا ہے تو ان کو اپنی قومی زندگی کے پچھلے پچھتّر سال پر سختی سے محاسبہ کرنا ہوگا اور پچھلی مساعی کی تہ میں جو نصب العین کارفرما تھا، اس پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔"

یہ نظر ثانی، یہ تنقید جو انسان کو ماضی پرستی اور روایاتِ کہنہ کی غلامی سے بچاتی ہے، ہر بیدار مغز مفکّر کا فرض ہے، لیکن ہمارے بیشتر تعلیمی مفکّر جزئیات اور غیر اہم مقاصد کے ایسے چکّر میں پھنسے ہوئے ہیں کہ وہ نہ بنیادی چیزوں کی طرف توجہ کر سکتے ہیں نہ ان میں غالباً اس کی صلاحیت باقی رہ گئی ہے۔ بیسویں صدی میں کم سے کم ہندوستانی مسلمانوں میں شاید ذاکر صاحب ہی ایسے عملی معلّم اور تعلیمی مفکّر ہیں جنھوں نے اس "فرض کفایہ" کو ادا کیا ہے، زمانے کی ناسازگاری کی وجہ سے یہ اندیشہ ضرور ہے کہ اس وقت ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہو، لیکن ایک مضبوط اور اچھے درخت کی طرح سچی بات میں یہ صفت ہے کہ وہ آہستہ آہستہ شور سرزمین سے سر نکالتی ہے اور کبھی نہ کبھی اپنا اثر پیدا کر کے دم لیتی ہے، گو یہ بات یقینی ہے کہ

بالآخر حق کا بول بالا ہو کر رہے گا، لیکن تقاضائے بشریت سے کبھی کبھی انھیں اس بات کا بڑا دکھ ہوتا ہے کہ ملک کی سیاسی مخالفتیں اور چپقلش اس تعلیمی اور تہذیبی کام کو بار آور نہیں ہونے دیتیں جو وہ اور ان کے ہم خیال اس قدر صبر اور ایثار کے ساتھ سالہا سال سے کرتے آئے ہیں۔ ایک دفعہ بنیادی تعلیمی کانفرنس[1] میں خطبہ دیتے ہوئے اس جذبے کا اظہار بہت جھجکتے ہوئے انداز میں کیا تھا:

"میں ان تعلیمی کام کرنے والوں کی ایک التجا اپنے ملک کے سب سیاسی رہنماؤں کی خدمت میں پہنچانا چاہتا ہوں کہ خدا کے لیے اس ملک کی سیاست کو سدھاریے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالیے جس میں قوم، قوم پر بھروسہ کر سکے، کمزوروں کو زور آور کا ڈر نہ ہو، غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے، جس میں تمدن، تمدن امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو پھل پھول سکیں اور ہر ایک کے دوسرے کی خوبیاں اجاگر ہوں۔ ..... مجھے یقین ہے کہ آج یہ بات ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھوں میں اتنی ہے جتنی پہلے کبھی نہ تھی کہ کچھ سمجھ کر، کچھ سمجھا کر، کچھ مان کر، کچھ منوا کر، ایسی ریاست کی نیو رکھ دیں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا تعلیمی کام کرنے والوں کا حال قابلِ رحم ہے۔ ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں، کب تک شبہے اور بدگمانی کے دھوئیں میں تعلیم کا دم گھٹ گھٹ کر سسکتے دیکھیں۔ کب تک ہم اس ڈر سے تھرّاتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محنت اور عمر بھر کی محبت کو کوئی ایک سیاسی حماقت، کوئی ایک سیاسی ضد بھسم کر دے گی؟ ہمارا کام بھی پھولوں کی سیج تو ہے نہیں۔ اس میں بھی بہت مایوسیاں ہوتی ہیں، اکثر دل ٹوٹتا ہے، پھر جب ہمارے قدم ڈگمگائیں تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈیں؟ کیا اسی سماج میں جہاں بھائی بھائی یک دل نظر نہیں آتے، کوئی قدر آخری قدر نہیں معلوم ہوتی، جس میں کوئی

---

[1] منعقدہ جامعہ ملّیہ، مورخہ ۱۱ اپریل ۱۹۴۱ء (لطیف اعظمی)

گیت نہیں جو سب مل کر گائیں، کوئی تہوار نہیں جو سب مل کر منائیں،
کوئی شادی نہیں جو سب مل کر رچائیں، کوئی دکھ نہیں جسے سب بٹائیں،
ہماری یہ مشکل دور کیجیے اور جلد دور کیجیے، اب بھی بہت دیر ہو چکی ہے
اور دیر نہ جانے کیا دن دکھائے۔

کہنے والا کہتا رہا، اپنی سی کرتا بھی رہا، تحریر سے، تقریر سے، اپنی زندگی کی روشن مثال سے، اپنی مثال کے اثر سے، لیکن بہت سے سننے والوں نے ایک کان سے سنا، دوسرے کان سے نکال دیا، یا کان تھے، لیکن ان سے سنا نہیں، آنکھیں تھیں لیکن ان سے دیکھا نہیں، دل تھے لیکن ان سے محسوس نہیں کیا اور اس کی پاداش دو ملکوں کے کروڑوں بندگانِ خدا آج تک بھگت رہے ہیں، لیکن ذاکر صاحب کی بتائی ہوئی قدروں اور اصولوں اور انسانی شرافتوں کا علَم اسی طرح بلند رہا اور ہے اور رہے گا۔

ذاکر صاحب کی امتیازی شان یہ ہے کہ وہ جہاں تعلیم کے بنیادی اصولوں اور قدروں کی غیر معمولی پرکھ رکھتے ہیں، وہاں ان میں یہ صلاحیت اور سلیقہ بھی ہے کہ وہ ان کو عملی جامہ پہنا سکیں، ہمارے تعلیمی کارکنوں میں فکر و عمل، نظم و نظر کا یہ امتزاج مشکل سے ملتا ہے ایسے ماہرینِ تعلیم ہیں جو خواب دیکھ سکتے ہیں، اپنے تخیل کی دنیا میں حسین محل تعمیر کر سکتے ہیں، لیکن عمل کی سنگلاخ زمین پر نہیں اتر سکتے، مگر ذاکر صاحب ان "مردانِ حر" میں سے ہیں جن کی بابت شاعر نے کہا ہے۔

مردِ حر سے نہیں پوشیدہ ضمیرِ تقدیر — خواب میں دیکھتا ہے عالمِ نَو کی تصویر
اور جب بانگ اذاں کرتی ہے بیدار اسے — کرتا ہے خواب میں دیکھی ہوئی دنیا تعمیر!

یہاں ذاکر صاحب کے تعلیمی نظریوں سے مفصل بحث مقصود نہیں، صرف ان کے چند بنیادی تصورات کی طرف اشارہ کرنا ہے، ان کا ایک بنیادی اصول ہے کہ فرد اور جماعت میں ایک نہایت گہرا رشتہ ہے اور انسانی ذہن کو اپنی تربیت کے لیے جس غذا کی ضرورت ہے، وہ اسے جماعت کے تمدن اور اسی کی مادی اور غیر مادی تحصیلات ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، یعنی "اس کے علم سے، اس کی زبان سے، اس کے ادب سے، اس کی صنعت و دستکاری سے، اس کے نظامِ اخلاق سے، اس کے

رسم و رواج سے، اس کی سماجی زندگی کے نمونوں سے، اس کے گاؤں، شہروں اور قصبوں کی تنظیمات سے، اس کی موسیقی سے، اس کی مصوّری سے، اس کی تعمیرات سے، اس کی دکانوں سے، اس کے کارخانوں سے، اس کی بڑی شخصیتوں کی زندگی کے نمونوں سے غرض اس کی تمام رنگارنگ تحقیقات سے" لہٰذا "جب کوئی تربیت طلب ذہن ان چیزوں سے دوچار ہوتا ہے تو ان میں سوئی ہوئی توانیاں اس میں جاکر بیدار ہوجاتی ہیں اور اس کے لیے یہ دفینے اپنے منہ کھول دیتے ہیں۔" اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو تعلیم ان تمدنی خزانوں سے بیگانہ اور ذہن اجتماعی کی ان زندہ تخلیقات سے بے نیاز ہوگی، اس میں نہ حقیقت کا جلوہ دکھائی دے گا نہ زندگی کا شرارہ، وہ موجودہ ہندستانی تعلیم کی طرح بالکل سطحی اور رسمی ہوکر رہ جائے گی، ہندوستانی تعلیمی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں بچّوں کی ذہنی تربیت کے لیے اس ملک کی متنوع تہذیب کے سرچشموں سے کام نہیں لیا گیا، بلکہ مغرب کی سطحی تقلید کی کوشش کی گئی، اس کی وجہ سے قوم کے تخلیقی سوتے خشک ہوکر رہ گئے اور تعلیم دفتری کاروبار سکھانے کے علاوہ کچھ بھی نہ کرسکی اور قومی زندگی کا دھارا اس سے متأثر نہ ہوسکا۔ اسی لیے ذاکر صاحب نے اپنے خطبات میں بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ تعلیم کو جماعتی تہذیب و تمدن اور اس کے مادّی اور غیر مادّی خزانوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

ساتھ ہی انھیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ افراد کی ذہنی اور جمالی اور علمی صلاحیتیں بہت مختلف ہوتی ہیں۔ اسی لیے مختلف ذہنوں کو ایک ہی غذا راس نہیں آسکتی، ہر ذہن کو "وہی چیز بھاتی ہے، جس کی ذہنی ساخت اس کی اپنی ذہنی ساخت سے مطابق ہو" اس حقیقت کو بھولنا (بقول ان کے) ایسا ہے "جیسے اندھے کو رنگ سے اور بہرے کو آہنگ سے تربیت دینے کی کوشش"۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی بہت سی تحریکیں جنھوں نے مغرب کی تعلیم میں جان ڈالی ہے اسی اصول کی تفسیر ہیں۔

ایک اور اہم تحریک جس کے ساتھ ذاکر صاحب کا نام نمایاں طور پر وابستہ رہے گا تعلیم میں ہاتھ کے کام کی اہمیت اور اس کے مقام کا تعین ہے، بہت سے دوسرے ملکوں میں علم و عمل، کتاب اور کام کی یہ "جنگ" بڑی حد تک ختم ہوچکی ہے،

لیکن ہندوستان میں، جو روایتی علم کا پجاری رہا ہے، جہاں ہاتھ کے کام کو اکثر ذلیل سمجھا گیا ہے، جہاں ذات پات کی تقسیم ایک حد تک کام کی نوعیت کی بنا پر کی گئی ہے، ابھی تک تعلیم کتاب اور لفظوں کے گورکھ دھندے میں گرفتار ہے اور بچوں کو ایک ایسے ناقص اور نامکمل نصاب کی پابندی کرنی ہوتی ہے، جس میں نسل انسانی کے بعض نہایت اہم اور بیش قیمت تجربات کے لیے گنجائش ہی نہیں۔ ذاکر صاحب نے پہلے جامعہ کی تعلیم میں اور اس کے بعد بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم کے ذریعہ یہ انقلاب آفریں نظریہ پیش کیا کہ جو تعلیم ہاتھ کے کام کو اس کا صحیح درجہ نہیں دیتی اور اس کو انسانی تربیت کا ذریعہ نہیں بناتی وہ سراسر ناقص ہے۔ مجھے معلوم ہے یہ نظریہ ذاکر صاحب کا ذاتی اجتہاد نہیں، اس کی ترتیب میں ان کے بہت سے نامور تعلیمی پیش رو شریک ہیں اور ہندوستان میں بھی جس وقت انھوں نے اس خیال کو پیش کیا، ان کے بہت سے ہم عصر اس کے موافق تھے، لیکن کسی نظریے کو بیان کر دینا ایک بات ہے اور اس کا علمی، عملی اور فلسفیانہ پس منظر سمجھنا اور سمجھانا اور تعلیم کے عمل میں اس کی چولیں ٹھیک بٹھانا اور بات ہے۔ اس خیال کی وضاحت اور علم اور تجربے کے رشتے کی تفسیر جس انداز سے ذاکر صاحب نے کی، اس سے ہماری تعلیمی بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے:

> "ایک واقفیت وہ ہوتی ہے، جس کے لیے دوسرے کام کرتے ہیں، ہمیں بیٹھے بٹھائے مل جاتی ہے، خبر کی حیثیت سے، ایک واقفیت ہوتی ہے جو ذاتی کاوش اور ذاتی تجربے سے ہوتی ہے، جزو ذہن بنتی، ذہن کو روشن کرتی، اس میں نظر پیدا کرتی ہے .... روایتی خبری علم بے جان ہوتا ہے اور بے نور، اس سے نہ دماغ کو روشنی نصیب ہوتی ہے، نہ روح کو بالیدگی، اکثر یہ نفس کی عیب پوشی کے لیے ایک خوش نما پردہ ہوتا ہے یا ایک خالی ظرف پر چڑھا ہوا چمڑا۔ آواز بہت دیتا ہے اور اندر سے ہوتا ہے کھوکھلا۔ تجربے سے حاصل کیا ہوا علم انکسار پیدا کرتا ہے اور وقار ذہن کو تربیت دیتا ہے، روح کو پرورش کرتا ہے اور ہمیشہ

آگے بڑھنے کی طاقت بخشتا جاتا ہے ..... جس جماعت میں بہت
بڑی اکثریت ہاتھ کے کام کو اپنا اہم شغل بنانے پر مجبور ہے اس کی
تعلیم گاہوں اور تربیت کے اداروں کو ہاتھ کے کام کی ہوا نہ لگنے دینا
کہاں کی دانش مندی ہے، سچ یہ ہے کہ قومی زندگی سے ایسی دوری
اور اس کے واضح مطالبوں سے ایسی بے اعتنائی اسی وقت ممکن ہے
جب یہ مدرسے گنتی کے چند خود غرضوں کو اوپر بڑھانے اور اپنی
جماعت کے سواد اعظم سے الگ کرنے کا ذریعہ ہوں۔"

اور پھر کام کی اخلاقی، سماجی اور عملی اہمیت کو جس خوب صورتی اور زور کے ساتھ انھوں نے اپنے بنیادی تعلیم والے خطبے میں بیان کیا ہے، اس کی مثال بہت مشکل سے ملے گی:

"جو اپنی ہی غرض کا کام کرتا ہے، وہ ہنر مند ضرور ہو جاتا ہے
مگر تعلیم یافتہ نہیں ہوتا جو قدروں کی خدمت کرتا ہے، وہ تعلیم پاجاتا
ہے، قدر کی سیوا میں آدمی کام کا حق ادا کرتا ہے، اپنا مزہ نہیں ڈھونڈھتا،
اس سے وہ آدمی بنتا ہے، اپنا اخلاق سنوارتا ہے ..... کام کی یہ
صفت ہاتھ کے کام میں ہو سکتی ہے اور دماغ کے کام میں بھی اور
ہاتھ کا کام بھی اس سے خالی ہو سکتا ہے اور دماغ کا بھی، کام کو تعلیم
کا ذریعہ بنانے والوں کو ہر دم یاد رکھنا چاہیے کہ کام بے مقصد نہیں
ہوتا، کام ہر نتیجے پر راضی نہیں ہوتا، کام بس کچھ کر کے وقت
کاٹ دینے کا نام نہیں، کام خالی دل لگی نہیں، کام کھیل نہیں،
کام کام ہے، بامقصد محنت ہے، کام دشمن کی طرح اپنا محاسبہ کرتا
ہے، پھر اس میں پورا اترتا ہے تو وہ خوشی دیتا ہے جو کہیں نہیں
ملتی، کام ریاضت ہے، کام عبادت ہے۔"

یہ خیالات اور جذبات خواہ کسی کے قلم سے نکلیں ان کے سحر سے متاثر ہونا ناگزیر ہے، لیکن جب یہ اس شخص کے قلم سے نکلیں جس نے پہلے ان کو اپنے دماغ میں سمویا ہو، پھر اپنے دل میں جگہ دی ہو، پھر اپنی زندگی میں برتا ہو، اس وقت ان میں

عقیدہ اور عمل کے خلوص کا بے پناہ اثر بھی شامل ہو جاتا ہے۔ ذاکر صاحب کی عظمت کا بڑا سبب یہی ہے کہ انھوں نے عمر بھر کام کیا ہے اور اعلیٰ قدروں کی سیوا میں کام کیا ہے اور اس وجہ سے ان کے کام کی اہمیت بہت بلند ہو گئی ہے، ورنہ صرف کام کرنے سے خواہ کتنا ہی ان تھک کیوں نہ ہو کوئی انسان اخلاقی بلندی تک نہیں پہنچ سکتا۔

ذاکر صاحب کی نظر میں تعلیم کا سب سے بڑا، سب سے اہم، سب سے بلند مقصد یہ ہے کہ وہ نوجوانوں کو سیوا کی زندگی کے لیے تیار کرے اور اس غرض پرستی اور تنگ نظری کے خلاف جہاد کرے، جو عصر حاضر کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو گئی ہے، وہ اس بات کو کافی نہیں سمجھتے کہ تعلیم افراد کی صلاحیتوں کی نشوونما کرنے کے بعد انھیں آزاد چھوڑ دے کہ وہ جس طرف چاہیں ادھر کا رُخ کریں اور ان کی سعی وعمل کی کوئی منزل کوئی رُخ معیّن نہ ہو، دراصل صحیح مقصد کا تعیّن ہی انسان کی صلاحیتوں اور ہنرمندیوں کو فرد اور سماج دونوں کے لیے برکت کا باعث بناتا ہے، ورنہ محض ذہانت اور چالاکی کا اظہار سٹّے بازی میں بھی ہو سکتا ہے اور سائنس کے کمالات جس زور شور سے جنگ کی غارت گری میں دکھائے جا رہے ہیں، ان کی مثال کسی امن کے شغل میں نہیں ملتی۔ ذاکر صاحب نے ایک دفعہ اپنے خطبے میں جو انھوں نے پنجاب کی ایجوکیشن فیلوشپ[۵۱] کے سامنے دیا تھا، جامع اختصار کے ساتھ سماج کی کھلی ڈھکی چوریوں کو ایک ایک کر کے گنوایا تھا اور ان کا سبب اسی بنیادی خود غرضی کو قرار دیا تھا جس نے ہماری ساری انفرادی اور جماعتی زندگی کو کھوکھلا اور اخلاقی اعتبار سے ناقص کر دیا ہے۔

خدمت کے نصب العین پر ذاکر صاحب کو اس قدر اصرار کیوں ہے؟ نہ صرف اس لیے کہ اخلاقی زندگی کی عمارت اسی صالح بنیاد پر قائم ہو سکتی ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ان میں اپنے ملک کی بے شمار محرومیوں اور بدنصیبیوں کا، اس کے جہل اور افلاس کا، اس کی بیماری اور بے کاری کا اور اس کی تمام بپتاؤں کا نہایت شدید اور گہرا

---

[۵۱] اجلاس منعقدہ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۴۲ء۔ (لطیف اعظمی)

احساس ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ اس روشن مستقبل تک پہنچنے کا، جس کی تصویر ان کے نہاں خانۂ دل میں سجی ہوئی ہے، صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے خدمت کا پل جو ہمارے حال کو ہمارے مستقبل سے ملائے۔ جب تک ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ ان تمام خرابیوں کے خلاف جہاد نہیں کرے گا اور قومی زندگی کو صدیوں کی غلاظت سے پاک نہ کرے گا، اس میں صفائی، فراخی اور شرافت پیدا نہ ہو سکے گی، جو شخص لینے کے لیے ہر وقت تیار ہے دینے کو آمادہ نہیں، وہ نظرِ حقیقت شناس میں ایک ذلیل سماجی مجرم ہے۔ یہ امتحان گویا افراد اور جماعتوں دونوں کے لیے حساب اور میزان ہے یا ایک پل صراط ہے جس پر ذرا لغزش ہوئی اور دوزخ کی گہرائی میں جا پہنچے۔

ایک دفعہ ذاکر صاحب کو، جن کی گوناگوں شخصیت ہر موقع کو خوب صورتی اور خوش اسلوبی کے ساتھ نباہ سکتی ہے، ایک طبّیہ کالج کے تقسیم اسناد کے جلسے میں مدعو کیا گیا۔ اس اجنبی ماحول میں بھی انھوں نے طلبہ سے فنِ طِب اور اس کے وسیع سماجی علائق کے متعلق ایسی نکتہ رس باتیں بیان کیں جو شاید کسی ماہرِ فن کے خیال میں بھی مشکل سے آتیں۔ اس موقع پر انھوں نے خاص کر خدمت کے آئیڈیل پر زور دیا اور اس کی وجہ اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کی:

> ✓ "یوں تو کوئی اپنی آنکھوں پر ٹھیکریاں رکھ لے تو کوئی اس کا کیا کر سکتا ہے، پر آپ کے چاروں طرف جو بیماری پھیلی ہوئی ہے، افلاس اور فاقے نے عام صحت کا جو حال کر رکھا ہے.... اس کا احساس آپ کو ہوگا تو آپ چین کی نیند نہ سو سکیں گے، زندگی کی بپتا، دُکھ اور بیماریاں ہم سے اتنی قریب ہیں کہ اکثر ہم ان سے غافل ہو جاتے ہیں، آہیں اتنے سینوں سے نکلتی ہیں کہ ساری فضا ان سے بھر جاتی ہے اور ہم انھیں سُن نہیں سکتے اور شاید اپنی زندگی گزارنے کے لیے ٹھیک ہی ہوگا۔ اس لیے کہ اگر احساس قوی ہو، ہر آہ سُنائی دے، اور ہر دکھ دکھائی دے تو ایسا ہو جائے جیسے کوئی گھاس کے اُگنے اور بڑھنے کی آہٹ سُننے لگے اور ہر جان دار کے دل کی دھڑکن محسوس کرنے لگے اور شاید ہم اس ہیبت ناک شور کی

تاب نہ لاسکیں جو بپتا کے اس سناٹے میں چھپا ہوا ہے ......
میری التجا آپ سے یہ ہے کہ اس دُکھ کو دور کرنے کے لیے آپ
کمر باندھیں .... آپ کے سامنے ایک مہتم بالشان کام ہے، مضبوط
دل اور بلند ہمت لوگوں کے کرنے کا کام ہے، خود غرضوں کے لیے
پیسے کمانے کا موقع (بھی) ہے، مگر ان کے سینے پر ہمیشہ یہ بوجھ
رہے گا کہ انھوں نے اپنے بنی نوع، اپنے ہم قوموں کے افلاس،
جہل، غلامی، بے بسی سے فائدہ اٹھا کر کچھ دھات کے سکّے جمع
کر لیے اور اپنی قوم کو اس سے نجات دلانے کے مبارک کام میں
ہاتھ نہ بٹایا.... دولت کے زنگ سے قومی زندگی کے جوہر کو محفوظ
رکھنے کے لیے کوئی چیز اتنی مؤثر نہیں ہوتی جتنا کہ بےغرض کام
کرنے والوں کا ایسا گروہ جو اس کے طوقِ زرّیں کا آرزو مند ہو بلکہ
جس کی ساری توجہ حق کی تلاش، سچ کے پرچار اور انسانوں کی خدمت
کے لیے وقف ہو۔"

اس ضمن میں اس عظیم الشان کارنامے کا ذکر بھی ضروری ہے جو ذاکر صاحب نے بنیادی تعلیم کے میدان میں انجام دیا۔ اس طریقِ تعلیم کا خیال اپنی ابتدائی شکل میں مہاتما گاندھی کے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ سیاست اور سماجی اصلاح کے سلسلے میں جو کام کر رہے ہیں اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک تعلیم کے نظام میں بنیادی تبدیلیاں نہ کی جائیں اور زندگی کے صالح تقاضوں کے ساتھ اس کا صحت مندانہ رشتہ قائم نہ کیا جائے۔ گزشتہ دو برس سے یہ رشتہ ٹوٹ گیا تھا اور تعلیم کتاب اور لفظوں کے گورکھ دھندوں میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ کام جو اس میں جان ڈالتا ہے، جو شخصیت کی تربیت کرتا ہے، اسکول کی چہار دیواری کے اندر بار نہ پا سکتا تھا، اس لیے انھوں نے قوم کے سامنے ایک تعلیم کا ایک ایسا تصوّر پیش کیا جو علم اور عمل میں ہاتھ کے کام اور کتابی تعلیم میں جسم اور دماغ میں، فرد اور سماج میں اور سماج کے مختلف طبقوں میں جو تضاد پیدا ہو گیا ہے، دور کر کے ان میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ جب ان کی بلائی ہوئی کانفرنس میں یہ تجویز پیش کی گئی تو اس کے ایک ممبر

ذاکر صاحب بھی تھے، ان کی ایک مصیبت یہ ہے کہ وہ اپنی خداداد قابلیت اور خلوص اور خوبیِ تقریر سے ہر کمیٹی اور کانفرنس پر چھا جاتے ہیں، چنانچہ یہاں بھی وہی حادثہ پیش آیا۔ کانفرنس بحیثیت مجموعی ان کے خیالات سے کافی متأثر ہوئی اور اس لیے گاندھی جی کی نظرِ انتخاب نے ذاکر صاحب کو اس کمیٹی کی صدارت کے لیے چنا جو اسکیم کو مرتب کرنے کے لیے بنائی گئی، چنانچہ ان کی قیادت میں قومی تعلیم کی وہ اسکیم تیار ہوئی جو بنیادی تعلیم کے نام سے مشہور ہے اور خواہ اس میں کتنی ہی ترمیم اور تبدیلی ہو، مجھے یقین ہے کہ اس پر ان کی چھاپ قائم رہے گی۔ انھوں نے اپنی دوراندیشی اور تعلیمی نظر سے کام لے کر اس اسکیم کو، جو اس وقت تک سرکاری حلقوں میں مردود اور عام تعلیمی حلقوں میں مشتبہ تھی، بڑی حد تک حشو و زوائد اور افراط و تفریط کی آمیزشوں سے پاک کیا اور اپنی قوتِ استدلال سے سنٹرل ایڈوائزری بورڈ کے ممبروں اور دوسرے ماہرینِ تعلیم کو اس کی تائید پر آمادہ کیا۔ گاندھی جی کے خیالات تو ایک خلاق ذہن اور زندگی کے نبض شناس کے خیالات تھے۔ ذاکر حسین کمیٹی نے ان کو تعلیمی تصورات اور جانی بوجھی تعلیمی اصطلاحوں کے سانچوں میں ڈھالا اور اس کی معنویت کو اجاگر کیا اور اس طرح تعلیمی صناع کی تراش و خراش کے بعد وہ اس شکل میں قوم کے سامنے آئی کہ فنی نقطۂ نظر سے اس پر جو بنیادی اعتراض کیے جا رہے تھے وہ بڑی حد تک بند ہو گئے، لیکن بعض اعتراض، باوجود اس تمام کوشش کے، جاری رہے، جن کی تشریح اور تنقید کا نہ یہاں موقع ہے نہ ضرورت۔ ان میں ایک اعتراض یہ تھا (زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے جن کی اپنی زندگی کتاب اور نقلی تعلیم کے طلسم میں اسیر رہی تھی) کہ اس میں ہاتھ کے کام کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور اس کو ابتدائی تعلیم کے ایوان میں مقامِ اعزاز دیا گیا تو مدرسے کارخانے بن کر رہ جائیں گے۔ تعلیم کے حقیقی اصولوں اور مقصدوں کو اسکیم کے اقتصادی اغراض پر قربان کر دیا جائے گا، بچوں کی ذہنی تربیت ناممکن ہو جائے گی اور ہمارا نیا نظامِ تعلیم اقبال اور ٹیگور جیسے افراد پیدا نہ کر سکے گا۔

ذاکر صاحب نے گزشتہ پچیس برس میں یعنی جب سے اس اسکیم نے جنم لیا، مختلف طرح بڑے دل کش اور دل نشیں انداز میں اس حقیقت کو سمجھایا کہ انسان کی زندگی میں کام کا مقام کیا ہے، وہ کام جو دیانت داری اور صداقت، مستعدی اور ذہانت

کے ساتھ کیا جائے اور خود جامعہ کے تعلیمی نظام اور اس کے مختلف اداروں میں وہ عملاً دس بارہ سال پہلے سے اسی اصول پر عمل کرتے رہے تھے، ان کا کہنا ہے کہ بچوں کے ذہن کی بیداری، سیرت کی پختگی، تخلیقی قوتوں کے آغاز اور جماعتی زندگی سے صالح رشتہ قائم کرنے کا بہترین ذریعہ کام ہی ہے، اجتماعی تہذیب و تمدّن کے بہترین عناصر کو فرد اسی طرح اپنی ذات کا جزو بنا سکتا ہے کہ وہ مختلف طرح کے کام کرے، ان میں نظر اور مہارت پیدا کرے اور ان کی قدروں کو اپنے اندر جذب کرے۔ انھوں نے کام کو، جو اس اسپرٹ میں کیا جائے، ریاضت اور عبادت کا درجہ دیا ہے۔ اس بارے میں ان کا قول میں درج کر چکا ہوں، خیال نیا نہیں، مذہب اور فلسفہ نے اور بعض ماہرین تعلیم نے بھی اس کو وقتاً فوقتاً مختلف انداز سے پیش کیا ہے، لیکن ہمارے سماج میں جو ذات پات کے بندھنوں میں گرفتار ہے اور جہاں بہت سی سماجی اور اقتصادی وجوہ سے ہاتھ کے کام کو ذلیل سمجھا گیا ہے، اس صداقت کو، اس عقیدے کو از سرِ نو مضبوطی اور قابلیت کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت تھی، ذاکر صاحب نے بڑی خوبی کے ساتھ اس فرض کو انجام دیا۔

انھوں نے بنیادی تعلیم کی محض تفسیر اور تعبیر ہی نہیں کی بلکہ اس کے مشکل اور دشوار گزار راستے میں جہاں جہاں بار بار غلطیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہیں، قدم قدم پر اس کی رہنمائی بھی کی، جب اندیشہ ہوا کہ یہ تحریک ایک عقیدے کی سی عصبیت اختیار کرے گی تو انھوں نے استادوں کی آزادیِ رائے، اور عمل اور تجرباتی ذہنیت کی تائید کی، جب بقول ان کے "دودھ میں اس قدر پانی ملایا گیا" کہ اسکیم میں محض پانی کا مزا باقی رہ گیا تو انھوں نے اس کے بنیادی اصولوں کی یاد کو تازہ کیا اور اس بات پر زور دیا کہ ہاتھ کے کام کو محض خانہ پُری کے طور پر شامل کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا، کام کو اس کے تمام آداب اور شرائط اور احترام کے ساتھ کرنا لازم ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ بچے" اسکول میں جو چیزیں بنائیں وہ ہر لحاظ سے اتنی اچھی ہونی چاہئیں جتنی وہ انھیں بنا سکیں اور اس قابل کہ انھیں بازار میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے"۔ جب تک وہ اس طرح کام نہ کریں گے، نہ ان کی شخصیت کی تربیت ممکن ہے، نہ ان میں صحیح قدروں کی لگن پیدا ہوگی۔ یہ بات ضروری ہے، خواہ بعد میں انھیں فروخت کرنے

کے بجائے سمندر ہی میں کیوں نہ پھینک دیا جائے۔ جب کبھی بنیادی تعلیم کو نا سمجھ اور تخیل سے عاری اُستادوں اور "ماہرینِ تعلیم" نے اس طرح چلایا کہ ڈھانچا رہ گیا اور روح نکل گئی۔ انھوں نے جرأت کے ساتھ انھیں ٹوکا کہ اس طرح کے مدرسے چلانا ریاکاری ہے۔ یا انھیں صحیح اصولوں پر چلاؤ ورنہ بند کر دو۔ ابتدا سے اب تک ان کا رویّہ اس تحریک کے ساتھ انصاف کا رہا ہے، جنبہ داری کا نہیں۔

یہ خیال غلط ہوگا کہ ذاکر صاحب کو اپنے کام میں مخالفتوں اور بدگمانیوں کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا۔ ان کی دیانت، خلوص اور قابلیت پر شاید ان کے بدترین مخالفوں اور نقادوں نے بھی شبہہ نہیں کیا، لیکن جامعہ کے کام اور اس کے بنیادی تعلیم کی سرگرمی کے سلسلے میں ان پر بہت سی بدگمانیاں اس وجہ سے کی گئیں کہ وہ اس وقت ایک لحاظ سے مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے جدا تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کانگریس اور لیگ میں رسّہ کشی ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ سے ہر سوال کو ایک خاص فرقہ واری نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے اور کسی چیز کو انصاف کے ترازو میں نہیں تولا جاتا۔ مثلاً ان پر ایک اعتراض یہ کیا گیا کہ انھوں نے خود کو ایک ایسی تحریک کے ساتھ وابستہ کیا جو گاندھی جی سے منسوب تھی۔ اس کا ایک مختصر جواب تو یہ ہے کہ "حکمت تو مومن کی کھوئی ہوئی پونجی ہے، جہاں کہیں وہ اسے مل جائے وہ اس کا حقدار ہے۔"[1] اگر حکمت کا کوئی پہلو، تعلیمی صداقت کی کوئی کرن ذاکر صاحب کو گاندھی جی کے سرچشمۂ فیض سے ملے تو وہ اس کو کیوں قبول نہ کریں؟ ناواقفوں اور ناسمجھوں کے اعتراض کی وجہ سے کسی چیز کو مسترد کرنا دانشمندی کا ثبوت نہیں، تعصب کی دلیل ہے۔ دوسرے یہ بھی یاد رہے کہ اس خاص تعلیمی

---

[1] اس اعتراض کا کہ جامعہ سیاست سے الگ رہنے کا دعویٰ کرتی ہے تو وردھا اسکیم کی تحریک میں اس نے کانگریس کا کیوں ساتھ دیا، اس زمانے میں یہ جواب دیا گیا تھا کہ جامعہ نے تعلیم کی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے، اس کام میں وہ ہر شخص اور ہر جماعت کے ساتھ تعاون کرنے اور اس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہے، اگر مسلم لیگ بھی کوئی تعلیمی اسکیم بنائے اور وہ پسند کرے تو جامعہ اس کے ساتھ بھی اسی طرح تعاون کرے گی۔ (لطیف اعظمی)

تحریک میں ذاکر صاحب نے گاندھی جی سے جس قدر لیا اس سے بھی زیادہ دیا اور بنیادی قومی تعلیم کے تصور پر ان کا نقش اس طرح ثبت ہے کہ اس طرح مٹایا نہیں جا سکتا۔ رہے محض جہالت کی گود میں پلے ہوئے اعتراض تو ان کی ذاکر صاحب نے کبھی پروا نہیں کی آخر جاننے والوں کے لیے نہ جاننے والوں کی رائے تو سند نہیں ہو سکتی۔

ایک دوسرا اعتراض یہ تھا کہ جب اسکیم میں مذہبی تعلیم کے لیے گنجائش نہیں تو انھوں نے کیوں اس کی تائید کی۔ اس اعتراض کا جواب تو وقت اس کا کافی وضاحت کے ساتھ دے چکا ہے اور اعتراض کرنے والوں پر یہ بھی حقیقت روشن ہو گئی ہے کہ ایک غیر مذہبی (سیکولر) ریاست کے سرکاری مدرسوں میں باقاعدہ "مذہبی تعلیم" کا انتظام کرنے میں کیا کیا اور کس قدر خطرے ہیں۔ تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ ارباب اقتدار نے مذہب اور مذہبی تعلیم کو اپنے مفادِ مخصوص کے لیے استعمال کیا ہے اور ذاکر صاحب نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان کے نظامِ تعلیم میں سرکاری طور پر مذہبی تعلیم کا انتظام کر کے یہ خطرہ مول لیا جائے۔ اس لیے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ مسلمان جو مذہب سے شغف رکھتے ہیں خود مذہبی تعلیم کا ایک آزاد نظام قائم کریں اور اس کو ایک جماعت کی حیثیت سے چلائیں، لیکن اس وقت کی مخالفت تو زیادہ تر محض مخالفت کی خاطر تھی اور ان کی اس مناسب تجویز پر کوئی مؤثر اقدام نہیں کیا گیا تھا۔ ایک دفعہ حکومت ہند کے مرکزی تعلیمی بورڈ کی ایک کمیٹی میں مذہبی تعلیم کا مسئلہ زیرِ بحث تھا، ہو سکتی ہے یا نہیں ہو سکتی؟ ہونی چاہیے یا نہیں ہونی چاہیے؟ اس کے کیا فوائد ہیں اور کیا خطرے؟ ذاکر صاحب نے مضبوطی کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کیا، اس کی اہمیت جتائی اور بتایا کہ کسی نہ کسی مناسب شکل میں اس کا انتظام ضروری ہے، لیکن بالآخر کثرت رائے سے یہ طے ہوا کہ مدرسوں میں تمام مذہبوں اور فرقوں کی تعلیم کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ جلسہ ختم ہونے پر ایک ممبر جو مذہبی تعلیم کی حمایت میں بہت سرگرم تھے ذاکر صاحب کے پاس آئے اور بولے "ذاکر صاحب آپ نے تجویز پیش کر کے مسلمانوں کے لیے مختصر سا ایک رسالہ دینیات کا نصاب میں رکھا دیا ہوتا تو مسلمان بھی خوش ہو جاتے اور کوئی مشکل بھی پیش نہ آتی، کوئی نہ کوئی اُستاد اسے پڑھا ہی دیتا، آخر ہر مدرسے میں اردو کا مدرس تو ہو گا ہی۔" ذاکر صاحب نے غالباً دل ہی دل میں اِنّا لِلّٰہ پڑھ کر ان کی

سمجھداری اور سنجیدہ مذہبیت کی داد دی ہوگی۔

لیکن ذاکر صاحب کی مذہبیت بالکل مختلف ہے۔ ان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کا مذہب کا تصوّر دوسرا ہے، ان کے دل و دماغ میں مذہب کی گہری محبت اور عقیدت ہے اور اس کی قدروں کی سچّی پرکھ۔ چنانچہ مروّجہ اسلامی درسگاہوں کی ناقص تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے انھوں نے اپنے "تعلیمی خطبات" میں لکھا ہے اور ان کی نظر اس مقام پر پہنچی جہاں معترضین کے طائرِ خیال نے پر نہیں مارا!

"مذہب کہ صدیوں اس جماعت کی زندگی کا مرکز رہ چکا تھا، چھوٹتا تو کیسے، مگر اس طرح قائم رکھا جائے کہ دوسرے ارادوں میں بھی مانع نہ ہو اور ترقی کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے، معاملات پر کہ اہلِ دنیا سے متعلق ہیں، اس کی تعلیمات اور حکمتوں کو زیادہ نہ اُبھارا جائے، چپ چپاتے دوسرے زیادہ ترقی یافتہ اہل دنیا کے اسالیب عمل کو اختیار کر لیا جائے، البتہ عقائد و عادات پر زبانی زور رہے اور عملاً رخصت! اور ہاں! احساس مذہبیت کے باب میں خود فریبی کے لیے مذہب کے ان حصّوں پر جو ماورائے عقل ہیں، عقلی بحثیں بھی ہوتی رہیں تو مضائقہ نہیں یعنی بقول اقبالؔ:

محو رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

ذاکر صاحب اس قسم کی مذہبی تعلیم کے قائل نہیں، ان کی نظر میں مذہب اس قدر اہم اور بنیادی چیز ہے کہ اس کے مقابلے میں زندگی کی تمام دوسری قدریں، دوسرے اغراض، دوسری مصلحتیں بے وزن ہیں اگر وہ روح مذہب کی نفی کریں۔ وہ مذہب کے معاملے میں کسی خود فریبی کو، کسی دکھاوے کے انتظام سے اطمینان حاصل کرنے کو نہ صرف ذہنی بد دیانتی سمجھتے ہیں بلکہ گناہ۔ اسی وجہ سے وہ چاہتے ہیں کہ مذہبی تعلیم اس انداز سے دی جائے کہ وہ افراد کی زندگی کے ہر پہلو پر اثرانداز ہو اور دین و دنیا دونوں کے معاملات میں افراد اس کے اصولوں پر کاربند ہونا سیکھیں، اس کے ذریعے لوگوں میں رواداری، فراخ دلی، اقدار اعلیٰ کے ساتھ وابستگی پیدا ہو

اور وہ زندگی کی نعمتوں اور خود زندگی کو امانت سمجھیں۔ ان کے مذہب کے تصور میں کسی قسم کی تنگی اور تنگ نظری کو بار حاصل نہیں، چنانچہ بنیادی اسکیم میں اخلاقی تعلیم اور سماجی علوم کی تعلیم کا جو نصاب تجویز کیا گیا اس میں ہندوستان کی مختلف مذہبی جماعتوں کے تہذیبی کارناموں اور ان کے خیالات اور عقائد کو جگہ دی گئی ہے تاکہ ان میں گزشتہ سینکڑوں برس سے جو باہمی داد و ستد رہی ہے اور ان کے فقیروں، سنتوں، صوفیوں، رشیوں اور دوسرے مردانِ خدا نے محبّت اور ہمدردی کا جو پیغام اس سرزمین میں پھیلایا ہے، وہ سب طلبا کی ذہنی اور جذباتی میراث بن سکے۔ اس قسم کی تعلیم نہ صرف اسلامی تہذیب و تمدّن کی نقیض نہیں بلکہ روحِ اسلام کے عین مطابق ہے۔ ممکن ہے یہ بات مذہب کے ان ٹھیکیداروں کی سمجھ میں نہ آئے جو اس کی معنویت سے ناواقف ہیں یا باہمی مخالفتوں اور تعصّب کو ہوا دے کر اپنی پوزیشن کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن آزاد اور اقبال، ذاکر اور ٹیگور اور گاندھی اور رادھا کرشنن کا مذہب کا تصور یہی ہے اور یہ کوئی بُرے مفتر نہیں ہیں مذہب کے! اسی لیے اس سلسلے میں ذاکر صاحب نے مخالفت اور بد گمانی کا سودا کیا اور جان بوجھ کر کیا، کسی فوری سیاسی غرض یا سستی مقبولیت حاصل کرنے کے لیے وہ حق پسندی کے جوہر کو کس طرح قربان کرتے، ان کی رگِ احتساب ہمیشہ اس وقت خاص طور پر بیدار ہوتی ہے جب کم عیار لوگ جذبات کی لہروں میں بہہ جاتے ہیں اور پاسبانِ عقل سے اپنا رشتہ توڑ لیتے ہیں۔

اگر یہ صحیح ہے کہ تعلیم کا اصلی مقصد شریف، سچّے اور دلیر افراد پیدا کرتا ہے جو بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے سربکف ہوں، اگر ایک اچھے مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تہذیب اور تمدّن، اپنے مذہب اور فلسفے، اپنے ادب اور آرٹ کے خزانوں سے انسانی تہذیب کے کیسے کو مالا مال کرے، اگر ایک اچھے ہندوستانی ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ ایک روادار، فراخ دل اور سچّے معنی میں مہذّب انسان ہو، اگر تعصّب، تنگ نظری، خود غرضی، افراد اور جماعتوں دونوں کے لیے بُری ہیں، اگر حق کی حمایت انسان کا فرض ہے خواہ اس میں اپنوں کا ساتھ چھوڑنا پڑے، اگر باطل سے جنگ کرنا ضروری ہے، خواہ سارا زمانہ اس کی تائید کرتا ہو، اگر انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنا اور غیروں کا احتساب سختی اور غیر جانبداری سے کرے اور حق کے معاملے میں نہ اپنا

اپنا ہو نہ غیر غیر۔ اگر یہ سب باتیں صحیح ہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ تعلیم کے ذریعے ذاکر صاحب جن قدروں کی اشاعت کرنا چاہتے ہیں، وہ نہ صرف مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے لیے بلکہ عام انسانیت کے لیے قابلِ احترام ہیں اور ذاکر صاحب کا شمار ان تخلیقی اثرات میں ہے جنھوں نے ہماری تعلیم اور ہماری نئی نسل کی ذہنیت کو ایک بہتر سانچے میں ڈھالا ہے، اس خاموشی اور صبر اور خوش دلی کے ساتھ جس طرح سورج کی روشنی مٹی کی تاریکی میں بیج کو پالتی ہے اور بارش کا پانی نازک پودوں کو پروان بڑھاتا ہے اور انھیں تازگی بخشتا ہے۔

ایک انگریز مصنف کا قول ہے "بعض لوگ پیدائشی بڑے ہوتے ہیں، بعض اپنی کوشش سے بڑائی حاصل کرتے ہیں اور بعض پر بڑائی زبردستی عائد کر دی جاتی ہے۔" دنیا میں اکثریت تیسرے قسم کے بڑے لوگوں کی ہے اور یہی گروہ ہے جو دوسرے انسانوں پر عافیت کے راستے بند کر دیتا ہے۔ دوسری قسم کے لوگ بھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور چونکہ وہ اپنی محنت سے پھل حاصل کرتے ہیں، اس لیے قابلِ تعریف ہیں۔ پہلی قسم کے لوگ، جن کی پیشانی پر بچپن ہی سے بلندی کا ستارا روشن ہوتا ہے، شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ کیوں کہ قدرت، جو اوسط اور گھٹیا نمونے بنانے میں بہت مشاق اور فیاض واقع ہوئی ہے، اعلیٰ نمونوں کی تشکیل میں بہت جزرسی سے کام لیتی ہے۔ لیکن سچی عظمت حاصل کرنے کے لیے ایک سخت شرط یہ ہے کہ فرد میں بڑا بننے کی فطری صلاحیت ہو اور پھر وہ اپنی محنت اور کوشش سے ان صلاحیتوں کے جوہر کو اُبھارے۔ جب وہب اور کسب کا قرآن السعدین ہو جاتا ہے، اس وقت انسانِ برتر کی تشکیل وجود میں آتی ہے۔ ذاکر صاحب کی ذات میں یہی امتزاج پایا جاتا ہے۔ انھوں نے قدرت سے غیر معمولی صفات پائی ہیں، لیکن وہ اس میراث پر قانع ہو کر نہیں بیٹھ گئے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم، محنت اور جفاکشی، تفکر اور تدبر کے ذریعے اپنی فطرت کے سونے کو کندن اور اپنے دماغ کی روشنی کو شعلۂ برق بنا دیا۔ میں نے ان کے بعض بڑے بڑے کاموں اور خیالات کا ذکر کیا ہے، لیکن ذاکر صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے کارناموں سے بھی زیادہ بڑے ہیں۔ آپ ان کے تمام کارناموں کو گنا دیجیے، ان کی تمام دماغی قابلیتوں کی فہرست تیار

کر لیجیے اگر جی چاہے تو اس میں ان کا سراپا بھی شامل کر دیجیے، لیکن ذاکر صاحب کی متنوع اور شاداب شخصیت ان تمام مجموعے سے بھی بڑی ثابت ہوگی۔ جس طرح ایک چابک دست مصور کا شاہکار اس کے رنگوں، لکیروں اور دائروں سے بڑھ کر کوئی چیز ہوتا ہے، جیسے اس میں اپنی ایک انفرادی روح پیدا ہوگئی ہے جو اس کو حسن اور کشش بخشتی ہے۔ ان سے مل کر انسان ہمیشہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی اپنی زندگی میں کچھ زیادہ فراخی، زیادہ گہرائی، زیادہ گرمی پیدا ہوگئی ہے۔ ان کی شخصیت ایک "دینے والی" شخصیت ہے۔ ایک فیض جاری ہے، ایک چشمہ رواں ہے، جس سے لوگ آتے ہیں اور مستفید ہوتے ہیں، لیکن "دینے" کے انداز میں ایسی شرافت، دل کشی اور انکسار ہے کہ لینے والے پر گراں نہیں گزرتا۔ اس میں کچھ دخل ان کے اس گہرے خلوص کو ہے۔ جو ان کی زندگی کے ہر پہلو پر رحمت کی طرح چھایا ہوا ہے اور کچھ انداز گفتگو کا کمال ہے، جس میں صداقت، ظرافت، وضاحتِ خیال، شفقت، جوش اور سادگی کا ایسا حسین امتزاج ہے جو آج کل بہت شاذ دیکھنے میں آتا ہے۔ ایک زمانے میں لوگ گفتگو کو فن لطیف سمجھتے تھے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے بزرگوں یا اہلِ فن کی صحبت میں بیٹھ کر باقاعدہ کسب کرتے تھے۔ اب بھی کہیں کہیں پرانے مہذب خاندانوں میں آپ کو ایسے لوگ مل جاتے ہیں جنھوں نے گفتگو کے آرٹ کو زندہ رکھا ہے اور ان کی باتوں میں اب تک وہی چاشنی اور گھلاوٹ اور فرصت کا احساس موجود ہے جو پرانے لوگوں میں پایا جاتا تھا، لیکن زمانے کی تبدیلی نے زندگی کی نبض اور حرکت تیز کر دی ہے، فرصت کا احساس باقی نہیں رہا اور باہمی داد و ستد اور بات چیت تک میں بھی کاروباری رنگ غالب آگیا ہے۔ لہٰذا چیخ چیخ کر بحث اور بے مزہ گپ کرنے والے تو بہت مل جاتے ہیں، لیکن زبان کو دل کے خیالات کا محض ترجمان بنا کر، شیرینی اور بے تکلفی سے گفتگو کرنے والے نہیں ملتے۔ ذاکر صاحب کا اندازِ گفتگو ان کا اپنا ہے۔ اس میں جہاں ایک طرف پرانے لوگوں کا آرٹ ہے، وہاں دوسری طرف وہ جوش اور سرگرمی بھی ہے، وہ ذہنی جودت اور بے ساختہ ظرافت بھی ہے، دلیل میں وہ تلوار کی سی کاٹ بھی ہے۔ جس کے بغیر اس دور میں کسی ذہین، طباع اور باخبر شخص کا کام نہیں چل سکتا۔ پرانے لوگوں کی بات چیت

زیادہ تر عشق و محبت، آرٹ اور فلسفہ، ادب اور تہذیب کی لطیف بحثوں تک آپ بیتی اور جگ بیتی کے واقعات اور تجربات تک محدود تھی۔ لیکن ذاکر صاحب کی گفتگو میں مذہب، سیاست، معاشرت، رومان، قصے کہانیاں، لفظی کارٹون، طب، دنیا کا انجام، انسان کا آغاز غرض ہر قسم کے مباحث آجاتے ہیں اور ڈاکٹر اقبال کی طرح انھیں ہر موضوع پر جو کچھ کہنا ہوتا ہے، اس میں مضمون اور انداز بیان دونوں کے اعتبار سے ایک خاص تازگی، جدت اور دل بستگی کا سامان ہوتا ہے۔ ان کا علم بہت وسیع ہے، لیکن اس کا بار نہ ان کی شخصیت پر پڑتا ہے، نہ ان کی تحریر، نہ ان کی تقریر، اور گفتگو پر۔ ان کے آرٹ اور خلوص اور بے ساختگی کی سیل ان کی علمیت کی سیل کو تھام لیتی ہے۔ ان کی انسانیت اس قدر وسیع ہے کہ اس میں چھوٹے اور بڑے کا کوئی امتیاز نہیں، خواہ وہ جامعہ کے کسی بڑھئی یا معمار سے گفتگو کر رہے ہوں یا وائسرائے کی کونسل کے کسی ممبر سے مخاطب ہوں یا مدرسے کے بچوں کو کوئی بات سمجھاتے ہوں یا کسی قومی مجمع کے سامنے خطبہ دے رہے ہوں۔ ہر موقع پر ان کی شخصیت میں ایک مخصوص سادگی اور خلوص، معقولیت اور خود اعتمادی، سچائی اور شرافت کا جلوہ نظر آتا ہے جو مخاطب کو متأثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ ان کی بحث کا ایک دلچسپ انداز یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے مخالف کی تمام باتیں تسلیم کرکے اس کے ہتھیار رکھا لیتے ہیں اور اس کے بعد اس کے تمام مبادیات سے وہ نتائج نکال کر دکھا دیتے ہیں جو اس سے بالکل مختلف ہوتے ہیں! جب ان پر اطمینان اور فرصت کی کیفیت طاری ہو (جو غم عشق اور غمِ روزگار کی بدولت ذرا کم ہوتا ہے عشق بھی دوسروں کی خاطر اور غم روزگار بھی) اس وقت ان کی گفتگو، ان کے دوستوں کے لیے ایک بے بہا ذہنی نعمت ہوتی ہے، اس وقت وہ ایسی باتیں نکالتے ہیں، ایسے نکتے پیدا کرتے ہیں، مذاق مذاق میں ایسی گہری، حقیقت آشکار چیزیں بیان کر جاتے ہیں جو دوسرے ذہین اور طباع لوگ مغز کھپا کر بھی نہیں کر سکتے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اگر اگلے روز صبح آپ ان سے کہیں کہ ذاکر صاحب کل جو اسکیم آپ نے بیان کی تھی وہ بہت خوب تھی ذرا اس کے فلاں پہلو کی تشریح تو کر دیجیے تو وہ نہایت سادگی سے جواب دیں گے "وہ تو مجھے یاد نہیں، آپ کہیں تو ایک اور اسکیم پیش کردوں۔"

اس مضمون پر نظر ڈالتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید ذاکر صاحب کو اچھی طرح نہ جاننے والے یہ کہیں کہ اس شخص نے ان کے بارے میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور غالباً ذاتی مراسم قوتِ تنقید پر غالب آگئے ہیں۔ دوسری طرف یہ اندیشہ دامن گیر ہے کہ ان کو قریب سے جاننے والے کہیں گے کہ اس شخص نے اتنا لکھا، لیکن ان کی جیتی جاگتی، حساس اور روشن، نرم وگرم، بااصول اور گداز شخصیت کو "قلم بند" نہیں کر سکا۔ ان دوستوں کو میرا جواب یہ ہے کہ آپ خود یہ کوشش کر دیکھیے اور اگر آپ زیادہ کامیاب ہوں، تو شاید مجھے آپ سے کم خوشی نہ ہوگی۔ مبالغہ کا الزام لگانے والوں کی خدمت میں یہی معذرت پیش کر سکتا ہوں کہ یہ ایک ایسے شخص کے تأثرات ہیں جو طبعاً بیشتر نام نہاد "بڑے آدمیوں" سے متاثر نہیں ہوتا جس کو بارہا یہ اندازہ ہوا ہے کہ عوام جن مقدس یا طلائی بتوں کو پوجتے ہیں، ان کے نفس میں اکثر خود غرضی اور تنگی چھپی ہوئی ہوتی ہے اور ان کے پاؤں گندی مٹی کے ہوتے ہیں۔ میں اس کا کیا علاج کروں کہ ذاکر صاحب کو قدرت نے جس سانچے میں ڈھالا ہے اور ان کو جن ذہنی اور اخلاقی صفات سے مالا مال کیا ہے، وہ اپنی نظیر آپ ہی ہیں۔ اگر ایک شخص بہترین مقرر بھی اور مصنف بھی، ماہرِ تعلیم بھی ہو اور ماہر اقتصادیات بھی، شفیق دوست بھی اور راہبر بھی، اگر وہ میر کارواں کی "نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز" رکھتا ہو لیکن لیڈری کی تنگ نظری اور خود پسندی سے پاک ہو۔ اگر اس کی اصول پسندی اس کی انسانیت کے گداز اور دردمندی کو کند نہ کرسکے اور اس کی مروّت اور دوستی، اس کی اصول پسندی کے راستے میں حارج نہ ہو، اگر وہ اپنی بیشتر زندگی فقر و ایثار کی حالت میں گزار دے اور قوم کو اس کی سزا نہ دے، قوم پر اس کا احسان نہ رکھے، اگر ایک شخص میں یہ تمام باتیں جمع ہو جائیں تو تنقید کیا کرے؟ جب اقبال کے وہ اشعار پڑھتا ہوں جن میں انھوں نے مردِ مومن کی شان بیان کی ہے تو ان کی ذہنی تفسیر ذاکر صاحب کے خد و خال سے کرتا ہوں۔ یہ بہت بڑی تعریف ہے، لیکن ان کے استحقاق سے بڑھ کر نہیں:

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز — اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز!
اس کا مقام بلند، اس کا خیال عظیم — اس کا سرور، اس کا شوق، اس کا نیاز، اس کا ناز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز!

پروفیسر محمد مجیب

پروفیسر محمد مجیب صاحب کی ذاکر صاحب سے پہلی ملاقات برلن (جرمنی) میں ہوئی، عابد صاحب بھی ان دنوں وہیں تھے۔ ان تینوں دوستوں میں اخوت اور رفاقت کا مضبوط رشتہ قائم ہوگیا اور انھوں نے یہ عہد کرلیا کہ وطن واپس آنے کے بعد تینوں مل کر جامعہ کی خدمت کریں گے۔ چنانچہ ۲۶ء میں یہ حضرات واپس آئے اور انھوں نے ایسی حالت میں جامعہ کو چلانے کا بیڑا اٹھایا جب اس کی حالت بہت نازک تھی۔

ذاکر صاحب نے شیخ الجامعہ کا کام سنبھالا اور مجیب صاحب جامعہ کالج میں تاریخ اور انگریزی ادب کا درس دینے کے علاوہ انتظامی کاموں میں ذاکر صاحب کی مدد کرتے رہے۔ ۴۸ء میں جب ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہو کر علی گڑھ گئے تو مجیب صاحب ان کے جانشین مقرر ہوئے اور اُس وقت سے اِس وقت تک شیخ الجامعہ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مگر اتنے قریبی اور گہرے تعلقات کے باوجود مجیب صاحب نے ذاکر صاحب کے متعلق بہت کم لکھا ہے، شاید اس لیے کہ دوست نے جو کام سونپا تھا اس سے ابھی تک فرصت نہیں ملی کہ دوستی کی کہانی بیان کریں۔ ایک وجہ اور بھی ہو سکتی ہے۔ ایک موقع پر مجیب صاحب لکھتے ہیں:

"میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو ۲۳ء سے جانتا ہوں اور بائیس برس ان کے ساتھ کام کر چکا ہوں۔ ان کو مجھ سے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ ان سے ملتا نہیں ہوں، مگر میں کیا کرتا، تصویر کو بہت

قریب سے نہیں دیکھا جاتا، بلکہ ہمیشہ کچھ پیچھے ہٹ کر اور اس طرح
کہ روشنی تصویر پر پڑے آنکھوں پر نہ پڑے۔ شخصیت کو بھی
ایسے ہی کچھ دور رہ کر، کچھ پیچھے ہٹ کر دیکھنا چاہیے۔ لیکن ہماری
قومی عادت ہے کہ جتنا زیادہ کوئی ہر دل عزیز ہوا، اتنا ہی زیادہ
اسے گھیرتے اور قریب سے تکتے ہیں۔"

بہر حال مجیب صاحب نے ذاکر صاحب کے تعلیمی خطبات کے لیے جو
پیش لفظ لکھا تھا اور ان کے مضمون "وردھا تعلیمی کانفرنس" کے وہ حصے جو ذاکر صاحب
سے متعلق ہیں، اگلے صفحات میں پیش کیے جاتے ہیں۔

مجیب صاحب نے، اس کتاب کے مرتب ہونے کے بعد، ذاکر صاحب پر
دو اور مضمون لکھے ہیں؛ ایک جامع اور مبسوط اس یادگار جلد کے لیے جو ذاکر صاحب کی
سترہویں سالگرہ کے مجوزہ جشن کے موقع پر ان کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے زیر ترتیب
ہے؛ دوسرا مختصر مگر ذاکر صاحب کی شخصیت کا بہترین خاکہ جو آل انڈیا ریڈیو دہلی
کی فوری درخواست پر انگریزی میں قلم برداشتہ لکھا گیا اور ۹ رمئی کو صدارتی انتخاب کے
اعلان نتیجہ کے بعد نشر کیا گیا۔ اس کا ترجمہ اس کتاب میں مقدمہ کے بجائے شامل
کر لیا گیا ہے۔

ذاکر صاحب اور بنیادی قومی تعلیم

پچھلی جولائی سے رسالہ "ہریجن" میں ایسے مضامین نکلنے لگے جن سے سمجھنے والے سمجھ گئے کہ گاندھی جی کے دل میں ایک نئی دُھن سمائی ہے، اسی طرح کی دُھن جس نے ستیاگرہ کی تحریک چلائی، قوم پرست ہندوستانیوں کو کھدر پہنایا اور دو مرتبہ ہندوستان کے سارے جیل خانے کانگریسیوں سے آباد کر دیے۔ یہ نئی دُھن تعلیمی ہے، مگر ابتداء اس کی اخلاق سے ہوئی اور اسے پیدا دنیاوی حکمتِ عملی کے اس جال نے کیا۔ جس میں اخلاقی حوصلے کا بلند پرواز عقاب اکثر پھنس جاتا ہے اور بیکسی کے غصے میں اپنی بوٹیاں نوچنے لگتا ہے۔ مدراس کی کانگریسی حکومت نے ارادہ کیا کہ شراب کی تیاری اور خرید و فروخت بند کر دے اور یہ سوال فوراً اُٹھ کھڑا ہوا کہ ایسا کیا گیا تو پھر تعلیمی منصوبوں کا کیا حشر ہوگا۔ اب تک تعلیم کا خرچ اس آمدنی سے نکالا گیا ہے جو شراب اور دوسری منشیات کی تجارت پر محصول لگانے سے ہوتی تھی اور اس آمدنی کے موقوف ہونے سے عام جبری تعلیم کا ارادہ پورا کرنا در کنار ان تعلیمی اداروں کی جان پر بن جائے گی جو اس وقت موجود ہیں۔ یہ صورتِ حال ایک مدراس کے صوبے میں نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے بیشتر حصے میں پائی جاتی ہے اور ہمارے ملک میں افلاس بھی اس طرح پھیلا ہے کہ مزید آمدنی کی ضرورت ٹیکس بڑھانے سے پوری نہیں کی جا سکتی۔ اس عملی دشواری نے گاندھی جی کے دل پر بہت اثر کیا۔ وہ سوچتے رہے کہ کیا کرنا چاہیے اور اچانک ان کے دل میں خیال آیا کہ تعلیم کو اپنا خرچ آپ برداشت کرنا چاہیے۔ اس سے

حکومت کا ہی کام آسان نہ ہوگا، بلکہ وہ بے روزگاری بھی بڑی حد تک دُور ہو جائے گی. جو ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم نے پیدا کی ہے. چونکہ تعلیم اپنا خرچ آپ برداشت تبھی کرسکتی ہے جب کتابیں پڑھا دینے کے بجائے دستکاری سکھائی جائے اور اتنا مال تیار کیا جائے کہ جسے بیچ کر اسکول اپنے اخراجات پورے کرسکیں۔ اپنا یہ خیال گاندھی جی نے "ہریجن" میں پیش کیا۔ لوگوں نے اس کے متعلق اپنی رائے دی اور گاندھی جی خود بھی اور نکتے اور تفصیلی باتیں جو ان کی سمجھ میں آئیں بیان کرتے رہے۔ لیکن یہ معاملہ اتنا سلجھا ہوا نہیں ہے کہ مضمون لکھ کر طے کرلیا جائے۔ اس وجہ سے وردھا میں فن تعلیم کے ماہروں اور کانگریسی وزیروں کی ایک کانفرنس کرائی گئی۔

کانفرنس کے صدر مہاتما جی خود ہوئے۔ ان کی صحت بہت نازک ہے اور اس ڈر سے کہ کہیں عین وقت پر ان کے قویٰ جواب نہ دے دیں انھوں نے چار پانچ روز پہلے سے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ لیکن کانفرنس کے پہلے اجلاس میں وہ قریب ڈیڑھ گھنٹے کے بولے اور تعلیم کا جو نیا طریقہ ان کے ذہن میں تھا اسے تفصیل سے بیان کیا .....

گاندھی جی نے جو تجویزیں پیش کیں وہ ایسی تھیں کہ ایک طرف وزیر جنھیں تعلیم کا انتظام کرنا تھا اور جو یوں بھی مالی مشکلات کے سبب سے پریشان تھے، اور دوسری طرف ماہرینِ تعلیم گھبرا گئے۔ وزیروں میں کوئی بھی نہیں مانتا تھا کہ تعلیم اپنا خرچ آپ برداشت کرسکتی ہے، لیکن اگر کانفرنس گاندھی جی کے اصرار پر طے کرتی کہ ایسا ہو سکتا ہے تو ان کی کچھ نہ چلتی۔ ان سے کہا جاتا کہ تعلیم کا بڑے پیمانے پر نئے اصول کے مطابق انتظام کرو اور اگر وہ ذرا بھی پس و پیش کرتے تو ہر طرف سے اعتراضات کی مار پڑتی۔ ماہرینِ تعلیم زیادہ تر اس وجہ سے گھبرائے کہ وہ تعلیم کی پیچیدگیوں اور استادوں کی کوتاہیوں سے واقف ہیں۔ انھیں اخراجات کا بھی اندازہ ہے اور اس لیے ان میں سے کوئی بھی یہ تسلیم کرنے پر تیار نہ تھا کہ مدرسوں میں دستکاری کے ذریعے مکمل تعلیم دی جاسکتی ہے یا دستکاری سکھانے سے مدرسے اپنا خرچ نکال سکیں گے لیکن دونوں اپنی بات کمزوریوں کے اعتراف کے پیرائے میں کہہ سکتے تھے۔ وزیر کہتے تو یہ کہتے کہ ہم میں اتنی انتظامی قابلیت نہیں ہے کہ ہم ایسے مدرسے بڑے پیمانے پر قائم

کرسکیں۔ ماہرین تعلیم یہ کہتے کہ اب تک ہم نے جس طریقے پر پڑھایا ہے، اس میں کتاب کے بغیر کام نہیں چلتا۔ کتاب کے ساتھ ہم اچھے استاد پر بھی بھروسا کرتے ہیں اور اگرچہ ہم خالی کتابی تعلیم کو برا سمجھتے ہیں، اور حتی الامکان ہاتھ کا کام بھی سکھاتے اور کراتے ہیں، ہم نے کبھی نہ یہ دیکھا ہے، نہ سنا کہ مدرسے اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو بیچ کر اپنا خرچ نکالتے ہیں۔ ہاں یہ بے شک ممکن ہے کہ ہم لڑکوں سے کارخانے کے اصول پر کام کرائیں اور کارخانے کا نام اسکول یا صنعتی اسکول رکھ لیں۔ کانفرنس میں ایسے لوگ موجود تھے جنھیں دعویٰ تھا کہ انھوں نے دستکاری کے ذریعے سے تعلیم دی ہے اور مدرسے کی مصنوعات سے تعلیم کا پورا خرچ نکلا ہے۔ اس لیے وزیروں اور ماہرین تعلیم کی معذرت آمیز مخالفت کا نہ جانے کیا نتیجہ نکلتا۔ لیکن گاندھی جی نے تقریر ختم کرکے جب لوگوں سے کہا کہ اپنی اپنی رائے دیں تو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اِدھر اُدھر دیکھ کر اور سب کی نظریں نیچی پاکر کھڑے ہو گئے اور ان کی تقریر نے سب کی مشکلیں آسان کر دیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خود بھی سمجھتے ہیں کہ سچی تعلیم وہ ہے جس میں انسان کی تمام صلاحیتیں نشوونما پائیں اور چونکہ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ خالی کتابیں پڑھ لینے سے یہ مطلب حاصل نہیں ہوتا، اس لیے وہ بھی چاہتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم میں خصوصاً ہاتھ کے کام کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے۔ لیکن یہ مسئلہ تعلیمی ہے، اس کا روحانیات، اہنسا، دیہاتی تہذیب، تکلی اور چرخے سے کوئی خاندانی تعلق نہیں۔ ذاکر صاحب نے تقریر شروع اسی سے کی۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی جی کا یہ خیال کہ وہ تعلیم کو ایک بالکل نئی صورت دے رہے ہیں صحیح نہیں، اس لیے کہ مشہور جرمن معلم پستالوتزی نے اسی طریقۂ تعلیم کو سب سے بہتر مانا ہے اور اس کے بعد سے اس خیال کو عام طریق تعلیم میں شامل کرنے کی برابر کوشش ہوتی رہی ہے اور سیکڑوں معلموں نے تجربہ کرکے اس خیال کو بہترین عملی روپ دینے کی ترکیبیں نکالی ہیں۔ اس وقت اسی طریقے کی ایک خاص صورت امریکہ میں پروجکٹ میتھڈ (منصوبی طریقہ) اور دوسری روس میں کومپلکس میتھڈ کے نام سے رائج ہے۔ لیکن یہ طریقہ اتنا محدود نہیں ہے۔ جتنا کہ گاندھی جی نے ظاہر کیا ہے۔ تکلی کے ذریعے ہر علم نہیں سکھایا جا سکتا ہے اور ایک دستکاری کو لے کر بیٹھ جانے سے کام کے ذریعے تعلیم دینے کا اصول برتا نہیں جا سکتا۔

گاندھی جی نے ابتدائی تعلیم کے لیے سات سال کی جو مدت مقرر کی تھی اس سے ڈاکٹر ذاکر صاحب نے اختلاف کیا، اس بنا پر کہ یہ تعلیم اس وقت ختم ہو جائے گی جو در اصل صلاحیتوں کے ظاہر ہونے کی عمر ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تعلیم اور تربیت نامکمل رہ جائے گی اور اس کا مقصد بھی یقین کے ساتھ نہ بتایا جا سکے گا کہ پورا ہوا یا نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ سات برس کے عام جبری تعلیم کو تکمیل دینے کے لیے ایسے مدرسے قائم کریں جہاں مخصوص صلاحیتوں کے مطابق تربیت دی جائے۔ یعنی ایک مدرسہ دستکاری اور صنعتی تعلیم کے لیے ہو تو دوسرا ریاضی اور علوم طبیعی کے لیے۔ اور چونکہ ادبی ذوق بھی مانی ہوئی صلاحیتوں میں ہے، اس کی تربیت کے لیے بھی ایک مدرسہ چاہیے۔ چونکہ ہم اس طریقِ تعلیم کو بہت بڑے پیمانے پر رائج کرنا چاہتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ہم چند ادارے منتخب جگہوں پر قائم کریں اور وہاں اس کا تجربہ کرکے ایسے نمونے بنا لیں جن کی پھر عام طور سے نقل کی جا سکے، ورنہ ممکن ہے کہ نئی تعلیم کے رواج سے ہمیں فائدے کی جگہ اُلٹا نقصان ہو۔

...... اسی روز سہ پہر کو کانفرنس کا دوسرا اجلاس ہوا۔ مہاتما جی نے شروع میں اعتراضات کا جواب دیا، لیکن ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ غلط فہمیاں رفع کریں اور یہ واضح کر دیں کہ وہ تکلی کا پرچار کرنا یا کسی نئے صنعتی نظام کی بنیاد رکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ ان کے بعد جن لوگوں نے ان کے قریب بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر تقریریں کیں، وہ ایک خاص ذہنی رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور اپنے پیر و مرشد کی کمزوری اور پست ہمتی سمجھتے تھے کہ وہ دوسرے کی بات سنتے ہیں اور اس کے تجربے اور علم کی قدر کرتے ہیں... گاندھی جی کی خواہش پر اسی روز رات کو آٹھ سے دس بجے تک کانفرنس نے بحیثیت کمیٹی کے ان کی تجویزوں پر غور کیا اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو اس کمیٹی کا صدر مقرر کیا۔ صدر کی حیثیت سے ذاکر صاحب کو ان لوگوں کی دل جوئی کرنے کا موقع مل گیا جنھیں ان کا یہ کہنا بہت ناگوار معلوم ہوا تھا کہ مہاتما جی کی تجویز نئی اور نرالی نہیں ہے اور انھوں نے ان تمام لوگوں کو تقریروں کا موقع دیا جو اپنی قابلیت ظاہر کرنے کے لیے بے چین تھے۔ کمال یہ تھا کہ کام بھی ہو گیا اور کمیٹی نے بحث کے بعد چار ریزولیوشن اتفاقِ رائے سے کانفرنس کے سامنے پیش کرنے کے لیے مرتب کر لیے......

آخر میں گاندھی جی نے کانفرنس میں جو خیالات ظاہر کیے گئے تھے ان پر ایک نظر ڈال کر کمیٹی کے چاروں ریزولیوشن کانفرنس کے سامنے پیش کیے اور سب اتفاقِ رائے سے منظور ہوئے۔ تب گاندھی جی نے اس نئے طریقۂ تعلیم کے لیے نصاب بنانے کی غرض سے ایک کمیٹی مقرر کی اور ذاکر صاحب کو اس کا صدر بنایا۔ ذاکر صاحب کو وردھا میں ایک دن کے لیے روک کر گاندھی جی نے نصاب کمیٹی کا پہلا جلسہ بھی کرالیا اور یہ کمیٹی غالباً نومبر کے آخر تک اپنا کام ختم کردے گی۔ ۔ ۔ ۔

(رسالہ جامعہ بابت دسمبر ۱۹۳۷ء)

"تعلیم کا جو نظام آج ملک میں رائج ہے، اسے قریب قریب سارے ہندوستانی بُرا کہتے ہیں۔ پچھلے زمانے میں وہ قومی زندگی کی اٹل ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکا اور اس کی طاقتوں کو ٹھیک راستے پر نہیں لگا سکا۔ آج جب کہ دنیا تیزی سے بدل رہی ہے اور قوموں کی زندگی نئے روپ لے رہی ہے، ہماری تعلیم زندگی کے اصلی دھارے سے الگ اپنے اُسی پرانے ڈھرے پر جاری ہے اور بدلتے ہوئے حالات سے میل نہیں کھا سکتی۔ نہ تو وہ ہماری روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے اور نہ اس کے سامنے کوئی ایسا بلند تخیل ہے جو قوم کے مُردہ جسم میں جان ڈال دے۔ وہ بچّوں کو یہ نہیں سکھاتی کہ سماج کے مفید رکن بنیں اور اپنا بوجھ آپ اُٹھائیں اور قوم کے کام میں اچھی طرح حصّہ لیں۔ اس کو چاہیے تھا کہ ایسی سماج کی جگہ جس میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتا ہے ایک دوسرے کو لوٹتا اور دباتا ہے، نئی سماج کا ڈول ڈالے جس میں سب مل کر کام کرتے ہیں۔ مگر اسے تو اس کی ہوا بھی نہیں لگی، اس لیے ہر طرف سے یہ پکار ہے کہ تعلیم کے اس نظام کو بدل کر ایک نیا نظام بنایا جائے، جس کی بنیاد انسانوں کی ہمدردی اور بھلائی پر رکھی گئی ہو، جو قوم کی ضرورتوں اور خیالات سے میل کھاتا ہو اور اس کی اہم ضرورتوں کو پورا کرتا ہو۔"

(ذاکر حسین کمیٹی کی رپورٹ مورخہ دسمبر ۱۹۳۷ء)

ذاکر صاحب کے تعلیمی خطبے

(ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے تعلیمی مسائل اور موضوعات پر اردو میں جس قدر خطبے دیے ہیں یا ریڈیو پر تقریریں کی ہیں، ان کا ایک مجموعہ جب "تعلیمی خطبات" کے نام سے پہلی مرتبہ ۱۹۴[illegible]ء میں شائع ہوا تھا تو پروفیسر مجیب صاحب نے اس کے لیے پیش لفظ لکھا تھا۔)

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے یہ خطبات نہ جانے کتنی مشکل سے لکھے گئے اور اب کتنے پس و پیش کے بعد شائع کیے جا رہے ہیں۔ آپ اسے یقین نہ کریں گے اور زبان کی روانی اور بیان کی قدرت جو ان خطبات کی ایک نمایاں خوبی ہے، خود اس کا ثبوت ہے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو لکھنے میں کوئی دشواری، کوئی تکلف نہ ہوتا ہوگا، پھر بھی یہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ یہ کام جو مصنف کی استعداد کو دیکھتے ہوئے کوئی دیر طلب کام نہیں، بہت مشکل سے انجام پا سکا ہے۔ خطبات کی زبان کی روانی، قلم کی روانی نہیں ہے، بیان کی وہ قدرت نہیں ہے جو ادیب مشق سے حاصل کرتے ہیں۔ یہ اس طرح لکھے ہی نہیں گئے جیسے کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ کتاب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ علم اور علم کے ساتھ انسان کو اپنے اندر بند کر لے اور اس لیے ہر کتاب نامکمل رہ جاتی ہے، جیسے وہ کپڑا جو پہننے والے کا جسم دیکھے بغیر کاٹا گیا ہو۔ ادبی تصانیف میں زبان کی قینچی اکثر کاٹنے والے کے قابو میں نہیں رہتی، خود اپنے ہنر دکھانے لگتی ہے۔ ان تعلیمی خطبات میں وہ

خالی نہیں ہے جو کتاب میں ہوتی ہے اور قدرتی استعداد نے زبان کو اپنا خادم بنا کر ان میں وہ خوبیاں پیدا کر دی ہیں جو ادیبوں کی تحریروں کو برسوں کی مشق اور محنت کے بعد نصیب ہوتی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان خطبات کا انداز تقریر کا ہے، تحریر کا نہیں۔ ان میں کوشش کی گئی ہے کہ قلم اور کاغذ اور کتاب کو درمیان سے ہٹا کر آپ سے براہِ راست بات کہی جائے، اور اس طرح کہی جائے کہ آپ کے دل کو لگے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو شخص ہر ایک سے اور ہر موقع کے مناسب بات کہنا چاہتا ہو اور کہہ سکتا ہو، اسے کتنا ناگوار ہوگا کہ نظر نیچی کر کے بیٹھے اور قلم کو کاغذ پر چلائے، اپنی تحریر کو دیکھے اور مخاطب کو بھول جائے، کتاب لکھے اور سمجھے کہ دل سے دل کی راہ یہی ہے۔

یہ تعلیمی خطبات مختلف موقعوں کے لیے مختلف لوگوں کے اصرار پر تیار کیے گئے۔ ان میں ہر ایک کا موضوع تعلیم کا کوئی بنیادی مسئلہ، کوئی اہم پہلو ہے اور مجموعی طور پر ان کا مقصد آپ کو سچی تعلیم سے روشناس کرنا اور اس کا یقین دلانا ہے کہ وہ کام جسے انجام دینا آپ ایک خاص سرکاری محکمے کے ملازموں کا منصب سمجھتے ہیں خود آپ کا سب سے بڑا اور سب سے اچھا کام ہے۔ ان خطبات کو پڑھنے کے بعد آپ کے ذہن میں تعلیم، درجہ اور امتحان، نصاب اور کتاب پر مشتمل یا کسب معاش پر منحصر نہ رہے گی، بلکہ خود ان بندشوں سے آزاد ہو کر آپ کو آزاد کرے گی۔ آپ دیکھیں گے کہ تعلیم کا سلسلہ شعور کو بیدار کرنے والے اثرات سے شروع ہو کر کلام الٰہی میں انتہا اور تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اس میں معلّموں کا منصب یہ ہے کہ تعلیم کی مختلف منزلوں میں رہنمائی کریں اور تعلیم حاصل کرنے والے کا فرض یہ ہے کہ معلّم سے معلّم کا پتا پوچھتا ہوا علم کے سرچشمے تک پہنچے۔ یہ تعلیم انفرادی تو ہوگی کہ ہر شخص اس سے اتنا ہی فیض حاصل کرے گا جتنا کہ اس کا ظرف ہو۔ لیکن علم کے لیے مقاصد معین کرنا اور اس کی تحصیل کا انتظام کرنا جماعت کے اختیار میں ہے، اس لیے آپ کو ان تعلیمی خطبات میں اس نظامِ تعلیم کے خاکے ملیں گے جو علم کی روشنی کو گھر گھر پھیلا سکتا ہے، سوئی ہوئی قوتوں کو جگا سکتا ہے، اور فرد اور جماعت کے درمیان وہ سچی ہم آہنگی پیدا کر سکتا ہے جو مذہب، اخلاق، سیاست، سب کا نصب العین ہے۔ تعلیم کی روح کو اس کے

جسم سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کے دل میں جتنی قدر تعلیم کے اس تصوّر کی پیدا ہو جو ان خطبات میں پیش کیا گیا ہے، اتنا ہی حوصلہ آپ کو اس کا بھی ہونا چاہیے کہ آپ کی کوشش سے یہ تعلیم ایک عام اور پائیدار نظام کی شکل اختیار کرے۔

(۱۷ اکتوبر ۱۹۴۲ء)

پروفیسر آل احمد سرور

پروفیسر آل احمد سرور ان چند ممتاز ادیبوں میں سے ہیں جو اردو زبان وادب خصوصاً فنِ تنقید میں عالمانہ بصیرت رکھتے ہیں اور ان شاعروں میں سے ہیں جن کے کلام میں شعریت، حسن کاری اور بلندیِ فکر ہوتی ہے۔ انھیں ذاکر صاحب سے بڑی محبت اور گہری عقیدت ہے۔ ان کی شخصیت اور علمیت کا اثر قبول کیا ہے اور رہنمائی حاصل کی ہے۔ چند بزرگوں کا ذکر کر کے خود لکھتے ہیں کہ "ان سب نے میری شخصیت کی نشوونما میں حصّہ لیا ہے، خصوصاً ذاکر صاحب نے۔ آئی سی ایس سے ذاکر صاحب نے طبیعت ہٹائی اور معلمی کے وزن و وقار کی طرف مائل کیا۔ ان کی وجہ سے قوم پرستی کا جذبہ اُبھرا، تعلیم کے مقصد کا احساس ہوا اور علم وادب کو زندگی کا خادم بنانے کا ولولہ ہاتھ آیا۔" سرور صاحب کو ذاکر صاحب سے قریب رہ کر ان کی شخصیت اور ان کے کارناموں کے مطالعہ کا اچھا موقع ملا ہے۔ انھوں نے ذاکر صاحب کی ادبی خدمات پر ایک مضمون لکھا ہے جو اگلے صفحات میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے بارے میں تین نظمیں کہی ہیں۔ ایک نظم تو اس وقت کہی تھی جب ۴۸ سنہء میں ذاکر صاحب جرمنی سے آنکھ کے کامیاب آپریشن کے بعد واپس تشریف لائے تھے۔ اس کا پہلا شعر ہے:

صد شکر اپنا مردِ قلندر پھر آگیا صحرا سے تازہ دولتِ عرفاں لیے ہوئے

ایک اور نظم کا عنوان ہے "نئے علی گڑھ کے نام، ذاکر صاحب کے توسط سے"۔ یہ ۵۱ سنہء میں کہی گئی ہے جب ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور ان کی رہنمائی میں

علی گڑھ کا نیا دور شروع ہوا تھا۔ اس کا پہلا بند ملاحظہ ہو:

اے کہ کرنوں سے تری اپنے سیہ خانے میں
چاند کا نور، ستاروں کی چمک باقی ہے
لالہ کاری سے تری بادِ خزاں کے باوصف
اپنے ویرانے میں پھولوں کی مہک باقی ہے
یہ تری تلخ نوائی ہے کہ گمراہوں میں
اپنی منزل پہ پہنچنے کی للک باقی ہے
کون سمجھے ترے پُرسوز تخیل کے سوا
ابھی برفاب میں شعلوں کی لپک باقی ہے

سب سے پہلے ۳۹ء میں "مردِ درویش" کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی جب ذاکر صاحب یورپ میں تھے اور دوسری جنگِ عظیم چھڑ جانے کی وجہ سے بڑی مشکلوں سے وطن واپس آسکے تھے۔ اس میں ذاکر صاحب کی سیرت و شخصیت کا بہت اچھا مرقع پیش کیا گیا ہے اس لیے ذیل میں اس کے منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

زمانہ جس کی تلاش میں تھا یہی ہے ہمدم وہ مردِ دانا
نگاہ جس کی ہے عارفانہ، مزاج جس کا قلندرانہ

وہ جس کا دستور حق پسندی، وہ جس کا آئین دردمندی
وہ جس کے ایثار بیکراں کا ہے معترف آج تک زمانہ

جلال بھی ہے جمال بھی ہے یہ شخصیت کا کمال سمجھے
خیال میں بجلیاں پرافشاں لبوں پہ اِک دلربا ترانہ

وہ جس کی چشمِ ستارہ بیں نے فلک بھی دیکھا جہاں بھی دیکھے
پسند دے کے جس کو آیا مگر کچھ اپنا ہی آشیانہ

اُفق پہ ہے روشنی سی لیکن وہ چشمِ بینا کہاں سے لائیں
ابھی جبینوں سے جن کی چھوٹا نہیں فرنگی کا آستانہ

ورق ورق ہے مرا صحیفہ ملے تو کیوں کر بنے تو کیوں کر
اُدھر نئی آرزو کی گرمی، اِدھر خمارِ مے شبانہ

"ہوا ہے گو تُند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ"

ڈاکٹر ذاکر حسین کی ادبی خدمات

افلاطون کے متعلق کہا گیا ہے کہ "اس کی شخصیت کے نظری اور عملی پہلو دونوں آکر جمالیاتی کمال میں مل گئے ہیں، مصلح اور مفکر کا تضاد آرٹسٹ کی ذات میں غائب ہو گیا ہے۔" یہ بات افلاطون کی شہرۂ آفاق کتاب "ریاست" کے اردو مترجم ڈاکٹر ذاکر حسین پر صادق آتی ہے۔

افلاطون سے لے کر برٹرینڈ رسل تک مفکرین و مصنفین کے یہاں یا تو علم کی گہرائی ہے یا ایک پیمبرانہ شان، یا حسنِ بیان کی چاشنی۔ یہ تینوں خصوصیات علیحدہ علیحدہ بھی اتنی اہم ہیں کہ مشکل سے ایک ذات میں جمع ہو سکتی ہیں۔ افلاطون کو ان سب کا بھرپور حصہ ملا تھا۔ ذاکر حسین کے یہاں بھی ان تینوں کے ایک لطیف امتزاج نے جلال و جمال کی ایک دھوپ چھاؤں پیدا کر دی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کے یہاں ایک مفکر کی تابانیِ فکر، ایک معلّم کی شفقت و مرحمت، ایک عاشق کا سوز و گداز، ایک مدبّر کا وزن و وقار، ایک صوفی کی درویشانہ شان اور ایک مہاتما کی سی معصومیت، سب کا جلوہ نظر آتا ہے۔ علوم میں ان کی نظر ہمہ گیر اور ان کی معلومات ہمہ رنگ ہیں۔ فلسفہ، اقتصادیات، ادب، سائنس، تعلیم، تصوف، مذہبیات ہر موضوع پر ان کا مطالعہ گہرا اور ان کا علم حاضر ہے۔ ان کے یہاں علم صرف معلومات کا خزانہ ہی نہیں، انسانیت کے اعلیٰ اقدار کی خدمت کا وسیلہ بھی ہے۔ وہ اگر صرف مصنف یا معلّم ہوتے تو بھی ان کا درجہ بہت بڑا ہوتا، مگر ان کی سیمابی فطرت نے کبھی تصنیف و

تالیف کے گوشۂ عافیت پر قناعت نہیں کی۔ انھوں نے جوشِ جنوں میں بارہا گھر چھوڑ کر جنگل کی راہ لی اور اپنے خونِ دل سے کتنے ہی ویرانوں میں علم و عمل کے پھول کھلائے۔ انھوں نے کتابوں میں کبھی اپنے آپ کو بند نہیں کیا، مگر جب کبھی کچھ لکھا تو اپنے خلوص، دل سوزی اور سماجی شعور کی وجہ سے الفاظ میں وہ پسی ہوئی بجلیاں بھر دیں جن کی وجہ سے ادب میں آب و تاب آتی ہے اور جن سے انسانوں کی زندگی بدلتی، سنورتی اور نکھرتی ہے۔ انھوں نے بڑے بڑے خواب دیکھے، مگر خوابوں کی لطافت اور رنگینی میں کھو جانے کے بجائے حقیقت کی سنگلاخ وادیوں میں یقین محکم اور عمل پیہم کے رنگ محل بنائے۔ انھوں نے اپنی بے نظیر تخلیقی صلاحیتوں سے بہت سے کام لیے، کتابیں لکھیں، خطبے تیار کیے، تعلیمی تصورات کو آب و رنگ دیا، مٹی اور پتھر میں جلال و جمال کے کرشمے دکھائے، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا، بکھرے ہوئے افراد کو بلند مقاصد کا آئینہ دے کر انھیں سماجی طاقت عطا کی، شخصیتوں میں کردار کی عظمت پیدا کی، اداسی میں امید کی جھلک دکھائی، راکھ میں شرر پیدا کیے، بنجر زمینوں میں پھول کھلائے۔ ذہنی توانائی کا یہ جوالا صرف کتابوں میں اپنے آپ کو کیسے بند کر سکتا تھا، ہاں شاید ان کی تصانیف کی خوبی کا راز یہی ہے کہ بقول مجیب صاحب "قدرتی استعداد نے زبان کو اپنا خادم بنا کر ان میں وہ خوبیاں پیدا کر دی ہیں۔ جو ادیبوں کی تحریر کو برسوں کی مشق اور محنت کے بعد نصیب ہوتی ہیں۔"

ذاکر صاحب کی پہلی قابلِ ذکر کتاب افلاطون کی "ریاست" کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کے متعلق مولانا اقبال احمد سہیل جیسے صاحبِ نظر کی یہ رائے قابلِ غور ہے کہ "افلاطون کو اردو آتی ہوتی تو وہ بھی یہی زبان اختیار کرتا۔" کتاب کا مقدمہ واقعی دریا کو کوزے میں بند کرنے کا ایک نادر نمونہ ہے۔ افلاطون کے تمام پہلوؤں سے ذاکر صاحب نے اردو دنیا کا تعارف ایسی پُر مغز، جاندار اور شگفتہ نثر میں کرایا ہے کہ پڑھ کر انسان وجد کرنے لگتا ہے۔ خود ترجمہ نہایت شستہ، رواں، سجل اور سلیس ہے۔ افلاطون کے نزدیک انسان محض انفرادی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ اپنی صلاحیتوں کو کمال کے درجے تک پہنچانے کے لیے ریاست کی رکنیت کا محتاج ہوتا ہے اس لیے کتاب میں اچھے انسان کی تلاش خود بخود اچھی ریاست کی تشکیل کے لیے ایک

رمز بن گئی ہے اور فلسفہ، سیاست، ادب، تاریخ سب کا ایک دفتر۔ یہیں سے
ذاکر صاحب کی طبیعت کا مخصوص رنگ ظاہر ہوتا ہے۔ علم ان کے یہاں ہنرمندی کا ایک
ذریعہ نہیں انسانیت کی خدمت کا ایک وسیلہ ہے اور کتابیں بکھری ہوئی معلومات کا
ایک انبار نہیں انسانیت کی آرائشِ جمال کے لیے آئینہ بن جاتی ہیں۔

جرمنی میں ذاکر صاحب مشہور معلم معاشیات پروفیسر زومبارٹ کے شاگرد تھے۔
اگر وہ اسی علم پر اپنی پوری توجہ مرکوز کرتے تو ہندوستان میں اس وادی کے امام ہوتے۔
استاد نے شاگرد کو ایک افہامی طریقۂ فکر دیا، جس کی مدد سے شاگرد نے اردو میں
معاشیات کے مسائل کو علمی مگر شگفتہ انداز میں بیان کیا۔ "معاشیات ـــــ مقصد اور
منہاج" کہنے کو ایک چھوٹی سی کتاب ہے، مگر اس میں معیاری، ترتیبی اور افہامی معاشیات
کے تمام بنیادی اصول نہایت دل نشین اسلوب میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ ذاکر صاحب
نے معاشیات پر بعض مغربی مفکرین کے خیالات کا ترجمہ بھی کیا ہے، مگر اس کتاب کی
اہمیت پھر بھی بہت ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ علمی مسائل کو صرف گمبھیر اور ادق
الفاظ میں ہی بیان کیا جا سکتا ہے، ان کے لیے یہ ایک مستقل سبق ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ
موضوع عام فہم انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ لکھنے والا چاہیے۔

ذاکر صاحب نے ترکِ موالات کے زمانے میں علی گڑھ چھوڑ کر جامعہ بسائی۔
جب یورپ سے واپس آئے تو جامعہ والے کس مپرسی کا شکار تھے۔ جامعہ کے
قائدین، سیاست کی وادیوں میں بھٹک رہے تھے اور قومی تعلیم کا یہ تجربہ دم توڑ رہا
تھا۔ ذاکر صاحب نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس شوق فضول کو جراُتِ رندانہ اور
جراُتِ رندانہ کو عین ہوش مندی بنایا، قومی اور علمی بنیادوں پر تعلیم کا راستہ ہموار کیا
اساتذہ کی ایک جماعت تیار کی، طلبا میں علم کی پیاس، اخلاق کی لگن اور خدمت کی
خلش بیدار کی اور ستاروں کے آگے دیکھنے والی نگاہ کو ایک تعلیمی بستی کی تعمیر کے
مشکل لیکن مقدس کام میں لگا دیا۔ اس تجربے، بصیرت، علم اور عرفان کا ثمرہ اردو
میں وہ کتاب ہے جو تعلیمی خطبات کے نام سے شائع ہوئی۔ اس میں جا بجا ایسے بلیغ
اور فکر انگیز اشارے ہیں جو مستقل تصانیف پر بھی بھاری ہیں۔ چونکہ یہ خطبے مختلف
اوقات میں لکھے گئے ہیں، اس لیے کہیں کہیں ان میں خیالات ہی نہیں الفاظ کی تکرار

بھی ہے، جا بجا خطابت بھی اپنا زور دکھاتی ہے مگر قومی تعلیم، بنیادی تعلیم، اچھے استاد، بچوں کی تربیت، سیرت کی تربیت، ثانوی تعلیم، مسلمانوں کی تعلیم پر ذاکر صاحب نے جس طرح اظہارِ خیال کیا ہے، اس سے ان کی اصابت رائے، بالغ نظری، حب الوطنی، سماجی شعور، نفسیاتی ژرف بینی، سب کا حیرت انگیز ثبوت ملتا ہے وہ علم اور ہنر میں فرق کرتے ہیں۔" جو اپنی ہی غرض کا کام کرتا ہے، وہ ہنرمند ضرور ہوتا ہے، مگر تعلیم یافتہ نہیں ہوتا، جو قدروں کی خدمت کرتا ہے، وہ تعلیم پا جاتا ہے، قدر کی سیوا اس آدمی کا حق ادا کرتا ہے، اپنا مزا نہیں ڈھونڈتا" مادی وسائل کی اہمیت کو وہ مانتے ہیں، مگر وہ انھیں سب کچھ نہیں سمجھتے "کون انکار کرسکتا ہے کہ روٹی کمانا زندگی کے اہم ترین کاموں میں سے نہیں ہے، لیکن اس فرض کو پورا کرنے میں آدمی پر اپنی شخصیت، انفرادیت اور آدمیت کا احترام بھی لازم ہے۔" وہ تعلیم کے کام کو ایک مقدس کام سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک یہ بھی عبادت سے کم نہیں۔ فرد کو ان خوبیوں سے آشنا کرنا جو انسانیت کی ضامن ہیں اور ان کے ذریعے سے اسے اجتماعی شعور سے ہم آہنگ کرنا، ان کے نزدیک انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہے اسی وجہ سے وہ تعلیم کو بعض اوقات سیاست سے بھی بلند درجہ دیتے ہیں۔ غالباً سیاست سے یہاں ان کی مراد وہ سستی سیاست ہے جو جلسوں اور جلوسوں کے چکر، انتخاب اور حکومت کے نشے سے عبارت ہے، ورنہ حقیقی سیاست میں تو تعلیم ایک بنیادی پتھر کا کام دیتی ہے جامعہ کی جوبلی کے موقع پر انھوں نے ارباب سیاست کو مخاطب کرکے جس درد اور دکھ کے ساتھ تعلیمی کام کرنے والوں کی دشواریوں کا ذکر کیا تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلط سیاست کا دھارا، تعلیم کے خاموش اور دیر طلب کام میں کیا کیا دشواریاں پیدا کرسکتا ہے اور اس تعمیری کام کو کس قدر صبر آزما بنا سکتا ہے[۱]۔ ذاکر صاحب نے ان خطبات میں استاد کا جو نصب العین پیش کیا ہے، وہ اس قابل ہے کہ اسے یہاں نقل کردیا جائے، کیوں کہ اس سے ان کے خیالات کی اہمیت اور اسلوب کی دل کشی دونوں پر روشنی پڑتی ہے:۔

---

[۱] اصل عبارت "اسلوب نگارش کے چند نمونے" میں صفحہ ۱۵۳ پر ملاحظہ ہو۔ لطیف اعظمی

"استاد کی کتاب زندگی کے سرورق پر علم نہیں لکھا ہوتا، محبت کا عنوان ہوتا ہے۔ اسے انسانوں سے محبت ہوتی ہے، سماج سے محبت ہوتی ہے۔ اچھے استاد کی جذباتی زندگی میں وسعت بھی ہوتی ہے اور گہرائی بھی اور پائداری بھی۔ اس کی روح میں حق و صداقت، حسن و جمال، نیکی اور تقدس، انصاف اور آزادی کے مظاہر کی گرمی ہوتی ہے، جس سے وہ دوسرے دلوں کو گرماتا ہے اور جس میں تپا تپا کر اپنے شاگردوں کی سیرت کو نکھارتا ہے، اچھے استاد میں اہل قوت اور حکمرانوں کی سیرت کا ایک ذرّہ بھی نہیں ہوتا۔ اس میں اور ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ حکمراں جبر کرتے ہیں اور یہ صبر کرتا ہے، وہ مجبور کر کے ایک راہ پر چلاتے ہیں اور یہ آزاد چھوڑ کر ساتھ لیتا ہے، ایک کے وسائل میں تشدّد اور زبردستی، دوسرے کے محبت اور خدمت۔ ایک کا کہنا ڈر سے مانا جاتا ہے، دوسرے کا شوق سے۔ ایک حکم دیتا ہے، دوسرا مشورہ۔ وہ غلام بناتا ہے، یہ ساتھی۔ جب ساری دنیا مایوس ہو جاتی ہے تو بس دو آدمی ہیں جن کے سینے میں امید باقی رہتی ہے، ایک اس کی ماں دوسرا اچھا اُستاد۔"

برنارڈ شا نے کہا ہے کہ جوشِ بیان اسلوب کا ابجد اور تمت ہے۔ اوپر کے اقتباسات میں خلوص، علم، اعتماد اور عرفان نے الفاظ کو آتش نفسی کا گُر سکھا دیا ہے۔ عام زبان سادہ ہے، مگر جا بجا دل کش ترکیبیں، مرصع فقرے دل میں اُتر جاتے ہیں اور رہ رہ کر یاد آتے ہیں۔ جذبات کا طوفان موج زن ہے، مگر اظہار پر مکمل قابو ہے۔ خیالات کی بازی گری نہیں ہے، علم کی نمائش نہیں ہے، فکر انگیز خیالات اس طرح چھلکتے ہیں، جیسے مینا سے آتش سیال اُبل جائے۔ طرزِ بیان پینترا نہیں ہے، طلسم سازی نہیں ہے۔ شخصیت کے جلوۂ صد رنگ کی آب و تاب ہے۔ اس میں فکر کی پیشانی کا جال، فنکار کے خونِ جگر کی شوخی اور ایک فرشتہ صفت انسان کی دردمندی اور دل سوزی کی گرمی اور حلاوت ہے۔ یہ طرزِ بیان ایک حسینہ کی

بے ساختہ ادائے دلبری ہے یا ایک مجاہد کی بے جھپک تیغ آبدار اس میں آمد ہی آمد ہے، آورد کا کوسوں پتہ نہیں۔

ذاکر صاحب کے بہت سے مضامین رسالہ جامعہ کے اوراق میں دفن ہو گئے۔ کاش انھیں کوئی ایک جا کر دیتا۔ رفتارِ زمانہ پر ان کے مضامین خصوصاً بیرونی ممالک کی سیاست پر ان کے تبصرے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں[1]۔ جامعہ کی جوبلی کے موقع پر انھوں نے جو خطبہ پڑھا تھا، وہ بھی ان کے اسلوب کا ایک دلکش نمونہ ہے اور جامعہ کے کارناموں پر ایک روشن تبصرہ۔ سر سید، نیا علی گڑھ، حالی محبِ وطن کی حیثیت سے، ذکرِ حسین، گاندھی جی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری کے متعلق ان کے تاثرات، ہندوستانی کیا ہے، غرض ہماری گزشتہ پچیس سال کی ذہنی، سیاسی، تہذیبی، تعلیمی اور ادبی زندگی کے ہر اہم موڑ اور ہر فیصلہ کن لمحے پر ان کے قلم سے تبصرے ہیں۔ ان کو یکجا کر کے شائع کیا جائے تو ذاکر صاحب کا ادبی سرمایہ جو اپنے موضوعات کے تنوع، اپنے افکار کی گہرائی اور اپنے اسلوب کی برگزیدگی کی وجہ سے بڑے سے بڑے ادیبوں سے کم نہیں ہے، اور بھی بڑا نظر آئے گا۔ زندگی کے اس مجاہد کو قلم ہاتھ میں لے کر یکسوئی سے اپنے افکار کو کاغذ کی نذر کرنے کی مہلت کب ملی جو کچھ لکھا ہے، سخت مصروفیت کے زمانے میں، مجبور ہو کر، راتیں آنکھوں میں کاٹ کر، صحت کی خرابی مول لے کر، مگر اس روا روی میں بھی ہر نقش خونِ جگر سے بنایا ہے اور اسی لیے اس کی آب و تاب ہمیشہ قائم رہے گی۔

ذاکر صاحب بہت کچھ ہیں، مگر سب سے پہلے وہ معلم ہیں۔ انھیں نوجوانوں سے اور بچوں سے بڑی محبت ہے۔ میں بچوں سے محبت کو بڑائی کی ایک علامت سمجھتا ہوں۔ انھوں نے نہ صرف بچوں کو انسانیت کے آداب سکھائے ہیں، بلکہ ان کے لیے کہانیاں، ڈرامے اور مضامین سب کچھ لکھے ہیں ـــــ پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی، مرغی جو اجمیر چلی، عقاب، ابو خاں کی بکری ـــــ جوان، بوڑھے سبھی ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ بچوں کے لیے یہ سیدھی سادی دلچسپ کہانیاں ہیں، جوانوں اور بوڑھوں

---

[1] اس کا نمونہ "طرزِ نگارش" میں ملاحظہ ہو۔ صفحہ ۱۵۴۔ (لطیف اعظمی)

کے لیے ان میں آزادی، حبِ وطن، انسانیت، تہذیب پر رمز و ایما کی ایک سحرکاری ہے۔ سویفٹ نے گلیور کے سفر کی جو داستان لکھی تھی، بچے اسے تفریح کی کان سمجھتے ہیں حالانکہ سویفٹ نے قصّے کہانی کے پردے میں انسان کی فطرت پر ایسے ایسے نشتر لگائے ہیں کہ سمجھنے والا تلملا کر رہ جائے۔ ذاکر صاحب طنز نگار نہیں ہیں۔ طنز نگاری کی بے تعلقی ان کے بس کی بات نہیں۔ ان کے یہاں ایک معلّم کی رحمت و شفقت ہے وہ انسانوں سے نہ مایوس ہوتے ہیں نہ بیزار۔ کہا جاتا ہے کہ خدا انسانوں سے ابھی تک بیزار نہیں ہوا ہے۔ خدا کی یہ صفت خدا کے اس نیک بندے کی شخصیت میں بھی جھلکتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اس میں بڑا مزا ہے کہ آدمی آدمیوں کے متعلق اچھے سے اچھا گمان رکھے اور چاہے روز فریب کھائے، ہر روز نئے سرے سے آدمیوں کی نیک دلی پر یقین کرے اور عقل مندوں کو اور بے وقوفوں کو کہ دونوں گمراہ ہوتے ہیں، معاف کرے۔"

جان کر یہ فریب کھانے میں جو مزا ہے وہ بڑی سے بڑی عقلمندی میں بھی نہیں۔

ذاکر صاحب نے جامعہ میں اردو اکیڈیمی کی بنیاد ڈالی۔ انھیں کی رہنمائی میں جامعہ نے اردو میں دیوان غالبؔ، رباعیات عمر خیام اور دیوانِ شیداؔ کے خوبصورت ایڈیشن ٹائپ میں شرکت کاویانی پریس برلن سے شائع کیے اور بعد میں مکتبہ جامعہ کو سنجیدہ ادب نہایت اہتمام سے دیدہ زیب انداز میں شائع کرنے کا حوصلہ دیا۔ انھیں کی رہنمائی میں رسالہ جامعہ نے برسوں اردو ادب کی خاموش اور ٹھوس خدمت کی۔ انھوں نے ہی علی گڑھ میں علمی ماحول پیدا کر کے علمی دنیا میں علی گڑھ کے وقار کو بلند کیا۔ انھوں نے ہی انجمن ترقی اردو ہند کے صدر کی حیثیت سے جدید ہندوستان میں اردو کے منصب اور مقام کو واضح کیا اور علی گڑھ پر اردو کا جو حق ہے وہ علی گڑھ والوں کو یاد دلایا۔ انھوں نے اپنی تحریر و تقریر سے سچی ہندوستانیت اور سچی انسانیت کا گہرا تعلق واضح کیا انھوں نے ادیبوں اور شاعروں کی ہمت افزائی کی ہے، ادب کی تعلیم کے معنی اور مقصد پر روشنی ڈالی ہے اور ادب کے ذریعے سے ملک و قوم کی خدمت

کو عبادت کا درجہ دیا ہے۔ انھوں نے ادب کو وسعت بھی عطا کی ہے، گہرائی بھی اور زندگی کی چہک دمک، تھرتھراہٹ اور گداز سے بھی آشنا کیا ہے وہ جامعہ اور علی گڑھ میں شدید مصروفیات کے باوجود جدید اور قدیم علوم کے مطالعہ میں برابر منہمک رہے ہیں۔ ان کے دن انتظامی امور اور رات مطالعے کے لیے وقف تھے۔ عملی دنیا میں علم کی ایسی پیاس اور علمی شغف میں اتنی عملی کاوشیں شاید ہی کسی کے حصے میں آئی ہوں۔ اس معلم، مفکر، مہاتما، صوفی اور علم و عمل کے پیکر کی ادبی خدمات کہاں تک گنائی جائیں۔ جس پر اقبال کے مرد بزرگ کے یہ اشعار ہو بہو صادق آتے ہیں، ان کی طرف تو اشارہ ہی کیا جا سکتا ہے :

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں
ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق

انجمن میں بھی میسّر رہی خلوت اس کو
شمعِ محفل کی طرح سب سے جُدا سب کا رفیق

مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزاد، معانی میں دقیق

اس کا اندازِ نظر سارے زمانے سے جُدا
اس کے احوال سے واقف نہیں پیرانِ طریق

پروفیسر محمد سرور

پروفیسر محمد سرور جامعہ کے قدیم طالب علم ہیں اور ایک طویل عرصے تک تاریخ اسلام کے استاد کی حیثیت سے ذاکر صاحب کی معیت اور رہنمائی میں کام کر چکے ہیں۔ ملک کی تقسیم کا اعلان ہوا تو وہ اپنے وطن مغربی پنجاب میں تھے، اور جامعہ واپس نہ آسکے۔ اس وقت وہ پاکستان میں علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ان کا مضمون جو اگلے صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے، ۱۹۴۱ء میں لکھا گیا تھا۔

ذاکر صاحب بحیثیت ادیب

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کو ایک زمانے سے اہل ملک جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شیخ الجامعہ یعنی پرنسپل[1] کی حیثیت سے جانتے آئے ہیں۔ ادھر دو تین برس سے واردھا تعلیمی اسکیم یا بصحیح معنی میں بنیادی تعلیمی اسکیم کے بنانے والوں کے صدر ڈاکٹر ذاکر کا بہت چرچا ہوا ہے، اسکیم کے حامیوں نے انھیں ہندوستان کا سب سے بڑا ماہر تعلیم مانا اور اس کے مخالفوں نے انھیں جو ان کے جی میں آیا کہا۔ مخالف سب کے سب مسلمان تھے اور شاید ڈاکٹر ذاکر کی شخصیت سے انھیں ایک گونہ عقیدت بھی تھی اور وہ ان کی خوبیوں اور ایثار کے معترف بھی تھے۔ لیکن سوال تھا ان کے نزدیک تمام مسلمان قوم کا اور مخالفین کا کہنا یہ تھا کہ بنیادی تعلیم کی اسکیم سے مسلمانوں کی قومی زندگی کو بہت سخت قسم کے نقصانات پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ بہر حال یہ مسئلہ ایک حد تک تعلیمی ہے اور بہت حد تک سیاسی۔ دونوں فریق نہایت خلوص سے اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں اور اب ان میں حَکَم بننا آسان نہیں۔ ہم یہاں ڈاکٹر ذاکر کی صرف اس حیثیت سے بحث کرنا چاہتے ہیں، جس پر کسی کو کوئی اختلاف ہی نہیں ہو سکتا اور وہ ہے ڈاکٹر صاحب بحیثیت ایک ادیب کے۔

---

[1] شروع میں شیخ الجامعہ کالج کے پرنسپل بھی ہوتے تھے اور بہت سے لوگ شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) کو پرنسپل کہتے تھے۔ (لطیف اعظمی)

موصوف کو شیخ الجامعہ اور صدر بنیادی تعلیمی اسکیم کے نام سے تو شاید ہی کوئی پڑھا لکھا ہو جو نہ جانتا ہو۔ لیکن یہ کہ ڈاکٹر ذاکر ایک بے نظیر مقرر اور بے مثل ادیب بھی ہیں، بہت ہی کم لوگوں کو معلوم ہوگا۔ وہ طبعاً "خلوتی" ہیں، "جلوتی" نہیں وہ تحریک خلافت اور ترکِ موالات کے ہنگامہ خیز دور کی پیداوار ہیں اور اسی بات نے انھیں ہنگاموں سے متنفر اور اشتہار بازی سے بے نیاز بنا دیا ہے۔ وہ مجمعوں میں نہیں بولتے اور نہ عام تشہیر کے لیے لکھتے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ گمنام رہنا چاہتے ہیں یا انھیں اپنی عظمت کا احساس نہیں۔ بات یہ ہے کہ آج کل بازارِ شہرت میں کھوٹی اور ملمع کی چیزیں ظاہری سج دھج سے نظروں کو خیرہ کر رہی ہیں۔ موصوف کو اس راہ سے منظرِ عام پر آنا ناپسند ہے۔ وہ "مائل بہ تغیر" قدروں کے قائل نہیں۔ وہ ابدی قائم بالذات قدروں کو مانتے ہیں اور انھیں پر اپنی آیندہ بڑائی کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر کی شخصیت کے یہ جوہر آپ کو ان کی تقریروں اور تحریروں میں ملیں گے اور اس لیے ضرورت ہے کہ ہم ان کو بحیثیت ادیب کے جانیں اور سمجھیں۔

یہاں ہم ڈاکٹر ذاکر کی ادبی شخصیت کا تجزیہ نہیں کریں گے۔ یہ بحث ہم کسی اور وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ وہ کیا ہیں؟ یہ ہم اس وقت نہیں بتا سکتے، ہاں وہ کیا کہتے ہیں؟ یہ ہم یہاں بتانا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر اردو میں لکھتے ہیں اور حتی الامکان اردو ہی بولتے ہیں اور انگریزی بولتے یا لکھتے ہیں تو ضرورتاً۔ ان کا خاص مضمون، جس میں انھوں نے برلن کی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی، معاشیات ہے۔ لیکن ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے اس لیے ان کی تحریر میں عام ہمہ گیری ہے، ایسی ہمہ گیری جو محض کتابوں سے مستفاد نہیں بلکہ زندگی کے نشیب و فراز سے ماخوذ ہے۔ ڈاکٹر ذاکر کا احساس بہت تیز ہے اور قوتِ فکر بڑی جولاں۔ اس طبیعت کا آدمی اکثر حقائق کے مقابلے میں اپنی فکر کی دنیا بنا لیتا ہے۔ اس کی پرواز عرش بریں سے بھی پرے تک جاتی ہے۔ وہ "یزداں" کو بے شک "کمند" میں لے آتا ہے۔ لیکن یہ دنیا، کوتاہیوں کی دنیا، بے عملیوں اور باتونیوں کی دنیا، مکر و ریا کی دنیا، خلوص و ایمان کی دنیا، کبھی ظلمت اور کبھی نور کی دنیا۔ الجھنوں اور گتھیوں کو وہ نہیں سمجھتا۔ ڈاکٹر ذاکر اپنی طبیعت کی اس افتاد سے واقف تھے۔ انھوں نے اپنی طبیعت کے

خلاف زبردستی ریاضت اور مجاہدے کے طور پر حقائق کی دنیا میں اپنی جگہ بنائی اور سالہا سال انھوں نے علم و ادب کی بلند پروازیوں یا دوسرے لفظوں میں ذہنی کاوشوں سے دور ہٹ کر ٹھوس زندگی کو اپنی تمام سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ چودہ برس[1] ہونے کو آئے، وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پرنسپل ہیں۔ جامعہ کے پرنسپل کے معنی یہ نہیں کہ وہ صرف تعلیم کا صدر اور نگراں ہے، بلکہ اس کی حیثیت ایک ایسے مالی کی ہے جو خود ہی زمین تیار کرتا ہے، پانی کا بھی وہی انتظام کرتا ہے، بیج کا انتخاب بھی اسی کے ذمے ہے اور باغ کی حفاظت اور نگرانی بھی اسی کا کام ہے۔ ظاہر ہے جو مالی یہ کرے گا، اس کی نظر کتنی حقیقت رس اور عملی ہوگی۔ چنانچہ جامعہ نے ڈاکٹر ذاکر "صاحبِ فکر" کو ذاکر "صاحبِ عمل" بنا دیا ہے۔ اب ان کے ادب میں ایک طرف اگر یزدانیت ہے جو ان کی خداداد ذہانت اور فطری طباعی کا حاصل ہے تو دوسری طرف زندگی کی حقیقت اور مادیت ہے جو جامعہ اور ماورائے جامعہ کی ٹھوس اور عملی دنیا کے تجربات سے انھیں ملی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر کا اکثر وقت جامعہ کے انتظام و اہتمام اور بیرونِ جامعہ کے تعلیمی معاملات کو سلجھانے میں صرف ہوتا ہے، جس کی وجہ سے پڑھنے کے لیے بہت کم وقت ملتا ہے اور لکھنے کے لیے اس سے بھی کم تر۔ لیکن جب کبھی وہ لکھتے ہیں یا تقریر کرتے ہیں تو سخت مجبوری کی حالت میں۔ یہ مجبوری ان کی تقریر یا تحریر میں واقعیت پیدا کر دیتی ہے اور یہ وصفِ خاص ہے ڈاکٹر ذاکر کی ادبی استعداد کا۔

ان کی تقریریں بیشتر جامعہ کی مجلسوں یا جلسوں میں ہوتی ہیں۔ کوئی ان کو لکھتا نہیں۔ ہاں ان کی تحریریں رسالوں یا کتابوں کی شکل میں شائع ہو جاتی ہیں۔ ایک زمانہ تک موصوف رسالہ جامعہ میں "رفتارِ زمانہ" کے عنوان سے کچھ نہ کچھ لکھتے تھے۔ یورپ اور دوسرے ملکوں کی سیاست پر اس سے بہتر اردو میں شاید لکھا گیا ہو۔

---

[1] ڈاکٹر ذاکر صاحب فروری ۱۹۲۶ء میں جرمنی سے واپس آئے اور اسی وقت سے جامعہ میں شیخ الجامعہ کے فرائض انجام دینے لگے۔ یہ مضمون ۱۹۴۱ء میں لکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ مدت غلط ہے۔ لطیف اعظمی

یہ مباحث گو وقتی ہوتے، لیکن جس انداز سے ان پر بحث ہوتی تھی وہ ان وقتی چیزوں کو مستقل بنا دیتا تھا۔ بچوں کے لیے آپ نے چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی لکھی ہیں، زبان بالکل بچوں کی ہے اور موضوع بھی بچوں کی پسند کا، لیکن بات اتنی گہری کہہ جاتے ہیں کہ بڑے بھی ان کو پڑھ کر سوچنے لگتے ہیں۔ ایک کہانی "ماں" ہے۔ ماں کی ممتا کی تصویر شاید دنیا کے کسی ادب میں اتنی مؤثر نہ کھینچی گئی ہو۔ "مرغی اجمیر چلی" "عقاب" "چھدو" وغیرہ کہانیاں مکتبہ سے شائع ہو چکی ہیں۔ آپ کی تصنیفات میں سے "مبادی معاشیات" معاشیات کی کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس سلسلے میں موصوف کی اہم تصنیف "معاشیات ــــــ مقصد اور منہاج" ہے۔ یہ مقالہ آپ نے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے کسی جلسے میں پڑھا تھا۔ کتاب کے نام سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ معاشیات کے محض اصطلاحی علم کی کوئی کتاب ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں ایک بنیادی بحث اٹھائی ہے۔ کارل مارکس کے مادی فلسفے سے یہ عقیدہ عام ہو چلا ہے کہ عقل ہی ایک ایسی کسوٹی ہے جو انسان کی زندگی کے سارے معیاروں پر حاکم ہے، خالص دلیل اصل چیز ہے، جذبات اور عقائد جن کی بنیاد خالص عقل پر نہ ہو وہ قابلِ التفات نہیں۔ مصنف نے اس کتاب میں اس اصول پر نہایت مفصل بحث کی ہے۔ یہ کتاب ہر طالب علم کے لیے خواہ اس کا مضمون معاشیات نہ بھی ہو، مفید ہے۔ لیکن ڈاکٹر ذاکر کا اصل کارنامہ جو ان کی ادبی زندگی کو زندہ جاوید بنائے گا وہ ان کا ترجمہ ہے، افلاطون کی مشہور و معروف کتاب "ریاست" کا۔ افلاطون اور ارسطو ہزارہا سال سے دنیا کی مختلف قوموں کے دلوں اور دماغوں پر حکومت کرتے چلے آرہے ہیں۔ مسلمان فلسفی اور صوفی دونوں ان سے متاثر ہوئے۔ ڈاکٹر ذاکر طبیعتاً افلاطونی ہیں۔ ریاست کا مقدمہ پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون خود بول رہا ہے اور کتاب دیکھیں تو ترجمہ نہیں معلوم ہوتی۔ شاید افلاطون اور ڈاکٹر ذاکر میں بہت سی خصوصیات مشترک ہوں گی چنانچہ اصل مصنف کی روح نے مترجم کی ذات میں یوں حلول کیا ہے کہ قارئین کے لیے مصنف اور مترجم میں فرق کرنا مشکل ہے اور افلاطون کی "ریاست" ڈاکٹر ذاکر کی "ریاست" بن گئی ہے۔ کتاب کی زبان اور اس کا اندازِ بیان کم سے کم اردو میں تو

بے مثل ہے۔ کتاب ساری مکالموں میں ہے اور ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ وہ مکالمے خود ڈاکٹر ذاکر کے اپنے معلوم ہوتے ہیں یعنی ان کی اپنی بات ہے جو وہ اپنے دوستوں اور شاگردوں سے کہہ رہے ہیں۔ وہی بات ہے، کہنے کا وہی ڈھنگ ہے۔ اگر ہم تناسخ کے قائل ہوتے تو ضرور کہتے کہ افلاطون کی روح نے دوبارہ "ریاست" کے اردو مترجم کا جنم لیا ہے اور شاید یہ بات ہو بھی صحیح۔ افلاطون کے عہد کا یونان کم سے کم ذہنی اور سیاسی انتشار میں اسلامی ہند سے بہت حد تک ملتا جلتا ہے۔

آخر میں ہم موصوف کے ایک ایڈریس کا ذکر کرکے اس بیان کو ختم کرتے ہیں۔ گزشتہ اپریل[1] میں جامعہ نگر میں دوسری بنیادی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر ذاکر اس کے صدر تھے۔ موصوف نے افتتاحی تقریر کی جو رسالہ کی صورت میں ہمارے پیش نظر ہے۔ کاش یہ ممکن ہوتا کہ ہم اس تقریر کے جستہ جستہ حصے نقل کرسکتے مجبوراً اس کے صرف ایک حصے پر اکتفا کرتے ہیں:

> "خدا کے لیے اس ملک کی سیاست کو سدھاریے[2] اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالیے جس میں قوم قوم پر بھروسہ کرسکے، کمزور کو زورآور کا ڈر نہ ہو، غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے، جس میں تمدن تمدن امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو پھل پھول سکیں اور ہر ایک سے دوسرے کی خوبیاں اجاگر ہوں، جہاں ہر ایک وہ بن سکے جس کے بننے کی اس میں صلاحیت ہے اور وہ بن کر اپنی ساری قوت کو اپنی سماج کا چاکر جانے۔ میں جانتا ہوں کہ ان باتوں کا کہہ دینا سہل ہے اور کرنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ آج یہ بات ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھ میں اتنی ہے جتنی کہ پہلے کبھی نہ تھی کہ کچھ سمجھ کر کچھ سمجھا کر

---

[1] ۱۹۴۱ء میں اپریل کے دوسرے ہفتہ میں یہ کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ لطیف اعظمی

[2] ڈاکٹر راجندر پرساد سے خطاب کرکے یہ بات کہی گئی ہے، جنھوں نے کانفرنس کا افتتاح فرمایا تھا۔ (لطیف اعظمی)

پھر مان کر کچھ سنو اکر ایسی ریاست کی نیو رکھ دیں۔ جب تک یہ نہیں
ہوتا ہم تعلیمی کام کرنے والوں کا حال قابلِ رحم ہے۔ ہم کب تک اس
سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں؟ کب تک شبہہ اور بدگمانی کے
دھوئیں میں تعلیم کو دم گھٹ گھٹ کر سسکتے دیکھیں؟ کب تک ہم
اس ڈر سے تھرتھراتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محنت اور عمر بھر کی محبت
کو کوئی ایک سیاسی حماقت، کوئی ایک سیاسی ضد بھسم کر دے گی۔
ہمارا کام بھی کوئی پھولوں کی سیج تو ہے نہیں، اس میں بہت
مایوسیاں ہوتی ہیں اور اکثر دل ٹوٹتا ہے، پھر جب ہمارے قدم
ڈگمگائیں تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈیں؟ کیا اسی سماج میں جس میں
بھائی بھائی ایک دل نظر نہیں آتے، کوئی قدر آخری قدر نہیں
معلوم ہوتی، جس میں کوئی گیت نہیں کہ سب مل کر گائیں، کوئی تہوار
نہیں جو سب مل کر منائیں، کوئی شادی نہیں جسے سب مل کر رچائیں،
کوئی دکھ نہیں جسے سب بٹائیں، ہماری یہ مشکل دور کیجیے اب بھی
بہت دیر ہو چکی ہے اور دیر نہ جانے کیا دن دکھائے گی۔"
اسی مسئلے کے متعلق موصوف کی کچھ اور باتیں بھی سن لیجیے۔ کچھ عرصہ ہوا
آپ نے بنارس کی قومی یونیورسٹی[1] کے فارغ التحصیل طلباء کو مخاطب کرتے ہوئے
فرمایا تھا:

"جب ذات پات، مذہب، زبانوں کے فرق سے ہمارا دیس
ٹکڑے ٹکڑے نظر آتا ہے، جس ملک میں اسٹیشنوں پر مسلمان
پانی اور ہندو دودھ ملتا ہے، جس دیس میں مختلف قسم کی نسلیں بستی
ہیں، جہاں بالکل مختلف انداز کے تمدن ساتھ ساتھ رائج ہیں،
جہاں ایک کا سچ دوسرے کا جھوٹ ہے، جہاں بت پرست اور
بت شکن کو قدرت نے ساتھ ساتھ دکھ سکھ کے لیے ساتھ جینے

---

[1] کاشی ودیا پیٹھ (لطیف اعظمی)

اور ساتھ مرنے کے لیے یک جا کر رکھا ہے۔ اس ملک میں نوجوانوں سے
ایسے مل کر کام کرنے کی آس ذرا مشکل ہے، مگر دل یہی گواہی دیتا ہے
کہ تھوڑے دن اور دھکّے کھانے کے بعد اس ملک کے نوجوان
دیس کی سیوا کے لیے یک دل ہو جائیں گے، اس لیے کہ میرا عقیدہ
ہے کہ ہندوستان کی قسمت میں قدرت نے یہ بات رکھی ہے کہ
یہاں بالکل مخالف قسم کے انسانی نمونے ایک دوسرے سے مل کر
ایک ایسا آدم تیار کریں جو تہذیب اور تمدّن کی ایک نئی تشکیل
کر سکے۔ قدرت کے اس تجربے اور قدرت کے اس ارادے میں
اس کی مدد کرنا تمھارا کام ہے اور اس مدد کے لیے اپنے آپ کو
اچھا آدمی بنانا اور اپنے دل کو کینہ کپٹ سے خالی کرنا لازمی ہے۔"
یہ مشن ہے ڈاکٹر ذاکر کا اور وہ اسی لیے زندہ ہیں اور اسی کے حصول کی
خاطر سرگرم کار۔

عبداللہ ولی بخش قادری

جناب عبداللہ ولی بخش قادری جو جامعہ ملیہ کے ٹیچرز کالج میں اُستاد ہیں، تعلیم و تعلّم کے تجربے کی وجہ سے اردو کی ریڈروں اور بچّوں کے ادب میں گہری نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس مضمون میں ذاکر صاحب کی کہانیوں کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے، اس لیے اسے اس مجموعے میں شامل کیا جاتا ہے۔

ذاکر صاحب کی کہانیوں کا تعلیمی پہلو

ذاکر صاحب ۱۹۲۶ء میں شیخ الجامعہ بنے، تو ان کی رہنمائی میں جامعہ نے اپنی تعلیمی سرگرمیاں نئے عزائم کے ساتھ شروع کیں۔ بچوں کی تعلیم اور اس کے مسائل سے دل چسپی رکھنے والے اس وقت بہت کم تھے۔ اردو ادب "بچوں کے ادیب" کے نام سے تقریباً ناآشنا تھا۔ بچوں کے لیے نظمیں تو لکھی جانے لگی تھیں لیکن نثر کا میدان قریب قریب خالی تھا۔ صرف مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی درسی کتابیں ہی بچوں کا اپنا سرمایہ کہی جا سکتی تھیں۔ ذاکر صاحب نے ایک معلّم اور مفکّر کی حیثیت سے بچوں کی تعلیم کو خصوصی توجہ کا مستحق سمجھا اور اردو میں بچوں کے ادب کی ترویج و اشاعت کو ایک اہم تعلیمی ضرورت قرار دیا۔ اسی سال رسالہ "پیامِ تعلیم" جاری ہوا۔ وہ جامعہ کا پیامِ تعلیم بن کر نکلا تھا، مگر کچھ ہی عرصے میں بچوں کا پیامِ تعلیم ہوگیا۔ جامعہ غالباً پہلی درسگاہ ہے جس نے بچوں کے ادب کی طرف توجہ کی اور تعلیم و نفسیات کے اصولوں کی روشنی میں ایسی کتابیں تیار کرنا شروع کیں جو ہر لحاظ سے بچوں کے لیے تھیں۔ بچوں کے لیے قصے کہانیاں لکھنا عام طور پر چھوٹوں کا کام سمجھا جاتا ہے، بڑے اور مشہور ادیب بالعموم اسے اپنی حیثیت سے فروتر سمجھتے ہیں۔ اس وقت تو اس کا چلن بھی نہیں تھا۔ جامعہ کے اساتذہ نے اس روایت سے بغاوت کی اور بچوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ لکھنے لگے۔ "پیامِ تعلیم" نے اپنے نام اور اپنے کام کو ایک کر دکھایا۔ ذاکر صاحب کی بیشتر کہانیاں، مختلف اوقات میں اسی

رسالے کی بدولت لکھی گئیں، یہ کہانیاں ان کی ایک لڑکی رقیہ ریحانہ کے نام سے، جن کا انتقال ہو چکا ہے، شائع ہوتی تھیں۔ ان کہانیوں کی تعداد اگرچہ کم ہے تاہم بچوں کے ادب کے جملہ اہم مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ارادی طور پر مختلف نمونے سامنے لاتے رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کی کہانیاں ایک اُستاد اور ماہرِ تعلیم کے احساسِ منصبی کے تحت وجود میں آئی ہیں جو حسنِ اتفاق سے اپنے سینے میں ادیب بھی چھپائے ہوئے ہے۔

ذاکر صاحب نے آج سے کوئی چالیس برس پہلے بچوں کے لیے کہانیاں لکھنا شروع کیں، جب آزادی کی جدوجہد زوروں پر جاری تھی، اس لیے ان کے سامنے وطنِ عزیز کے لیے پکے جاں نثار اور سچے پرستار پیدا کرنے کا اوّلین کام تھا۔ جامعہ کا وجود ہی جدوجہد آزادی کی تڑپ کا نتیجہ تھا۔ ذاکر صاحب نے وہ تڑپ بھی دیکھی تھی، اس کے محرکات سے بھی باخبر تھے اور اب ان ہی پر قیادت کی ذمہ داری آ چکی تھی۔ بچوں کی کہانیاں لکھتے وقت وہ کیوں کر اپنے مشن سے غافل رہ سکتے تھے۔ ان کی کہانی "ابّو خاں کی بکری" آزادی کی سچی لگن پیدا کرتی ہے، اور اس سے قربانی کا درس ملتا ہے۔ اس کہانی میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے، اپنے بہترین انداز میں کہا ہے:

> "الموڑے میں ایک بڑے میاں رہتے تھے۔ ان کا نام ابّو خاں تھا۔ انھیں بکریاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ اکیلے آدمی تھے۔ بس ایک دو بکریاں رکھتے ...... ابّو خاں غریب تھے بڑے بدنصیب۔ ان کی ساری بکریاں کبھی نہ کبھی رسّی تڑا کر رات کو بھاگ جاتی تھیں ...... یہ بکریاں بھاگ کر پہاڑ پر چلی جاتی تھیں۔ وہاں ایک بھیڑیا رہتا تھا، وہ انھیں کھا جاتا تھا ..... ایک دن کہیں سے ایک بکری مول لے آئے۔ یہ بکری ابھی بچہ ہی تھی ..... ابّو خاں نے سوچا کم عمر بکری لوں گا تو شاید ہل جائے ..... اس کا نام چاندنی رکھا تھا"۔ لیکن ایک دن چاندنی بھی نکل بھاگی، پہاڑ پر پہنچی تو بھیڑیے کا سامنا ہو گیا،

چاندنی نے بھیڑیے کے آگے سر نہیں جھکایا۔" وہ خوب جانتی تھی کہ بکریاں بھیڑیے کو نہیں مار سکتیں۔ وہ تو صرف یہ چاہتی تھی کہ اپنی بساط کے مطابق مقابلہ کرے۔ جیت ہار پر اپنا قابو نہیں۔ وہ اللہ کے ہاتھ ہے۔ مقابلہ ضروری ہے۔" چاندنی رات بھر بھیڑیے کا مقابلہ کرتی رہی، لیکن صبح ہوتے ہوتے "چاندنی بے دم زمین پر گر پڑی۔ اس کا سفید بالوں کا لباس خون سے بالکل سرخ تھا۔ بھیڑیے نے اسے دبوچ لیا اور کھا گیا۔"

لیکن کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اس کا اصل مقصد ابھی باقی ہے۔ ذرا دیکھیے کس سادگی اور پرکاری سے فلسفۂ حریت سمجھا دیا ہے۔ کہانی یوں ختم ہوتی ہے۔

اوپر درخت پر چڑیاں بیٹھی دیکھ رہی تھیں۔ ان میں یہ بحث ہو رہی ہے کہ جیت کس کی ہوئی۔ سب کہتی ہیں کہ بھیڑیا جیتا۔ ایک بوڑھی سی چڑیا ہے، وہ مصر ہے کہ چاندنی جیتی۔"

ذاکر صاحب کی ایک اور کہانی "عقاب" بھی جذبۂ آزادی کو ابھارتی ہے اور غلامی کی زنجیریں توڑنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اس کہانی کے ابتدائی حصے میں پہاڑ پر گھاس کے جمنے کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ مستقل مزاجی ہی میں کامیابی ہے۔ آگے چل کر ایک بلی کی اپنے ماحول سے وابستگی کو ظاہر کیا ہے اور دکھایا ہے کہ ایک عقاب کسی بھی لالچ سے مقیّد رہنے پر رضامند نہیں ہوتا ہے۔ وہ جدوجہد کرتا ہے تو آزاد ہو جاتا ہے اور پھر کہتا ہے: "خدا کا شکر ہے، پھر آ پہنچا اپنے وطن میں، پھر پا لیا اپنا دیس۔"

آج کل قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے ملک میں خاص طور پر تعلیمی میدان میں مختلف اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ لیکن ذاکر صاحب کا حق شناس دل تعلیم کے اس منصب کو پہلے سے ہی جانتا تھا۔ ان کی کہانی "اندھا گھوڑا" یوں تو حسنِ سلوک کا سبق دیتی ہے اور جانوروں کے ساتھ اچھا برتاؤ بھی اس کا

موضوع قرار دیا جاسکتا ہے، لیکن ذرا اس کے یہ چند جملے ملاحظہ ہوں :

"اب سنو! اسی شہر عادل آباد میں ایک بڑی مسجد تھی اور ایک بڑا مندر۔ اس میں نیک مسلمان اور ہندو آکر اپنے اپنے طریقے سے اللہ میاں کا نام لیتے اور ان کو یاد کرتے تھے .... گھنٹے کے بجتے ہی شہر کے اچھے اچھے مسلمان، ہندو وہاں آجاتے۔"

اسی طرح ان کی کہانی "آؤ گھر گھر کھیلیں" کئی بچے مل کر کھیلتے ہیں۔ ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ وہ ایک ہی گھر میں کھیلتے ہیں، ایک ہی کھیل کھیلتے ہیں، کیوں کہ ان سب کی گھریلو زندگی یکساں ہے۔ ان سب بچوں کے نزدیک خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، گھر کا تصور ایک ہی ہے۔ ایسے بیان سے بچوں کو آپس کے میل ملاپ کی دعوت ملتی ہے۔ اس زمانے میں جب کہ جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں، بچوں کے ادب کی طرف خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بچوں کے اندر تعصب کا بیج ایسے موضوعات اور مضامین ہی بوتے ہیں جو یکطرفہ ہوتے ہیں اور جانبداری کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔ ذاکر صاحب کے دیے ہوئے نمونوں سے سبق سیکھنا چاہیے۔

بچوں کی زندگی میں حفظانِ صحت کی تعلیم بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ "سعیدہ کی اماں" ایک ایسی ہی کہانی ہے جس میں کھلی ہوا کی اہمیت سمجھائی گئی ہے۔ "منّی کی بیماری" میں حفاظتی تدابیر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس کہانی میں ایک بچہ ڈاکٹر بنتا ہے۔ بچوں کے لیے اس کی ایک ہدایت سنیے: "دیکھو، منّی کے تولیے سے کوئی منہ نہ پونچھے، نہیں تو اس کی آنکھیں بھی دُکھنے آجائیں گی۔" اس کہانی کا اسلوب بھی بڑا پیارا ہے۔ کہانی کیا ہے، بلکہ واقعی بچوں کا کھیل ہے۔ بچے اس حقیقت کو پڑھ کر خوش بھی ہو سکتے ہیں اور اس پر عمل بھی کر سکتے ہیں۔ بچے بہر حال ماحول سے سیکھتے ہیں۔ ان کی نقل کی یہ خصوصیت بتائی جاتی ہے کہ وہ مقصد دیکھتے ہیں، ذرائع کی پروا نہیں کرتے، بلکہ خیال آفرینی کی بدولت سب کچھ مان لیتے ہیں۔ ذرا بچہ ڈاکٹر کو ملاحظہ فرمائیے، "چنّو نے منّی کے کپڑے اتارے، ڈاکٹر صاحب نے انگلی سے ادھر ٹھونکا، اُدھر ٹھونکا، منّی کا آبخورہ چھاتی پر رکھا اور کہا "منّی کہو، ایک، دو،

تین، ہاں ایک دو تین ۔" اس طرح بچوں کی اپنی زندگی کو اس رنگ میں پیش کر دیا ہے جو انھیں اختیار کرنا چاہیے، تاکہ زندگی کی جیتی جاگتی تصویروں سے وہ لطف بھی اٹھائیں اور ان کی زندگیاں بھی سدھریں۔ اس کہانی کے ذریعے یہ نکتہ بھی سمجھا دیا گیا ہے کہ بچے ایسی چیز خوب پسند کرتے ہیں جو انھیں تجربے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

ذاکر صاحب کی ہر ایک کہانی کا موضوع بچوں کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مثلاً "اسی سے ٹھنڈا اسی سے گرم" میں سائنس کی معلومات پیش کی گئی ہیں، "مرغی کا نرالا بچہ" ایک ایسی کہانی ہے جس سے "بادنما" کے بارے میں جاننے کی خواہش اُجاگر ہوتی ہے اور اس سے باہمی تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ "سچی محبت" میں لالچ کی خرابیاں دکھلائی گئی ہیں، "جولاہا اور بنیا" میں نیکی کا فائدہ اور لالچ کا نقصان دکھلایا گیا ہے، "آخری قدم" میں یہ احساس دلایا گیا ہے کہ نام و نمود سے بے نیاز ہو کر کام کرنا چاہیے۔ اس طرح ذاکر صاحب نے اپنی کہانیوں کے ماحول اور ان کے کرداروں کے عمل سے اقدار کو بچوں کے دل و دماغ میں جاگزیں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک کہانی "ماں" میں ماںتا کو اس طور پر ظاہر کیا ہے کہ اس کے پڑھنے سے ماں کے مرتبے اور اولاد کی ذمے داری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ "بیکاری" میں غریبوں کی زندگی کا حال اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ بچوں کے دل میں ان سے محبت پیدا ہو۔ "مرغی اجمیر چلی" میں اہل غرض کی باتوں پر کان دھرنے کے برے نتائج پیش کیے ہیں۔ "پھدو" اور "پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی" جیسی کہانیوں کے ذریعے بچوں میں جرأت آزمائی کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے، ان کی قوتِ متخیلہ ابھرتی ہے اور تجسس کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

بچوں کے لیے اخلاقی کہانیاں لکھنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ عموماً بچوں کے ادب کے نام پر پند و نصائح کا مجموعہ ہی ملا کرتا ہے۔ ذاکر صاحب کی اخلاقی کہانیاں معلمانہ بصیرت کے ساتھ اچھے اخلاق اور نیک اطوار کی تعلیم دیتی ہیں۔ اچھا ادیب، واعظ یا ناصح نہیں بنا کرتا۔ وہ اصول بھی نہیں گناتا، بلکہ اس کے بیان سے یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ ذاکر صاحب کی کہانیوں کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں تلقین نہیں کی جاتی۔ بس کہانی بیان کر دی جاتی ہے۔ ذاکر صاحب ایک

اچھے معلّم کی حیثیت سے بچے کو اس مقام پر پہنچا دیتے ہیں، جہاں سے وہ خود سب کچھ سمجھ سکتا ہے۔ مثلاً صفائی کا احساس دلانے کے لیے، اس کی اہمیت جتانے کے بجائے یوں کہتے ہیں "ہم غلیظ آدمی کو اندر آنے نہیں دیتے" یا "ان کا گھر بہت صاف تھا"۔ اچھے اطوار سکھانے کے لیے نہ نصیحت کی ضرورت ہوتی ہے نہ فضیحت کی، بلکہ یوں کہہ کر گزر جاتے ہیں "یہ ہم لوگوں سے ذرا اچھے ہوتے ہیں، کیوں کہ ان کے لڑکے کسی پردیسی کو ستاتے نہیں"۔ ایسے جملے دو چار نہیں ہیں بلکہ ذاکر صاحب کی کہانیوں کا اسلوب ہی یہی ہے۔

بچوں کے ادبی مذاق کا انحصار اس پر بھی ہے کہ انھیں کیسا تعلیمی مواد فراہم کیا جاتا ہے۔ بچپن کا درس ہی آئندہ کے ذوقِ مطالعہ کی بنیاد بنتا ہے۔ ذاکر صاحب کا قلم بچوں کی تعلیمی اور نفسیاتی ضرورتوں کے احساس و ادراک کے ساتھ اٹھا ہے۔ انھوں نے خیالات کو آسان زبان اور دلچسپ بیان کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی کہانیاں اخلاقی قدروں کو موزوں اور مؤثر انداز میں ابھارتی ہیں اور ننھے ننھے ذہنوں میں ان تمام محاسن کا شعور پیدا کرتی ہیں، جن کی تعلیم ایک معلّم اپنی ذمہ داری خیال کرتا ہے۔

عبداللطیف اعظمی

مجھے ذاکر صاحب سے تعلیم حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے اور ان کی رہنمائی میں کام کرنے کا فخر بھی۔ مگر دونوں کی مدت بہت مختصر ہے۔ سنہ ۳۶ء میں جب میں جامعہ آیا تو ذاکر صاحب کو پڑھانے کی فرصت نہیں تھی۔ سنہ ۴۰-۳۹ء میں وہ ہماری خواہش اور اصرار پر معاشیات پڑھانے کے لیے تیار ہوئے۔ ان کے پڑھانے کا طریقہ جس قدر دل نشین تھا، وہ تھا ہی، جو لکچر دیتے اور نوٹ لکھاتے وہ ان کے اپنے ہوتے، کسی کتاب میں نہ ملتے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سنہ ۴۱ء میں میں نے جامعہ میں کام شروع کیا تو اس وقت سے سنہ ۴۸ء تک، جب ذاکر صاحب علی گڑھ چلے گئے، مجھے ان کی رہنمائی اور مشورے کی سعادت حاصل رہی۔

صدر جمہوریہ ——— ڈاکٹر ذاکر حسین

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ہندوستان کے صدر جمہوریہ منتخب ہو گئے ——— ایشیا کی ایک عظیم جمہوریہ کے صدر ——— اس شاندار کامیابی میں ذاکر صاحب کی محبوب شخصیت اور ان کی پُر خلوص خدمات کو دخل ہے۔ مگر اس جیت میں تنہا ان کی ہی جیت نہیں ہے، یا کانگریس کی ہی نہیں ہے، بلکہ ہندوستانی قومیت کی جیت ہے، سیکولرزم کی جیت ہے، اس سے زیادہ شرافت اور بھل منساہت کی جیت ہے، اخلاص اور ایثار و قربانی کی جیت ہے۔ ذاکر صاحب نے اپنی عوامی زندگی میں بہت سے حیرت انگیز کارنامے انجام دیے ہیں۔ مثلاً ۱۹۴۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کو، جب کہ ان میں شدید کشمکش تھی، اور ایک دوسرے کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں تھا، ذاکر صاحب کی محبوب شخصیت نے جامعہ کے پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیا۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ آج، جب کہ اکثریتی فرقہ کے کانگریسی امیدواروں کی کامیابی یقینی نہیں سمجھی جاتی، اقلیتی فرقے کے ایک فرد کی ملک کے سب سے بڑے عہدے کے لیے کامیابی یقیناً حیرت انگیز ہے۔ اسے ذاکر صاحب کی شخصیت کی سحر کاری کہہ سکتے ہیں یا پھر ان کے ارادوں اور مقاصد کا خلوص، جو اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتا۔

نیک اور شریف لوگ سیاست سے دور بھاگتے ہیں، لیکن آجکل تو اس کی گندگی ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ گئی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو جیسی بھاری بھرکم

شخصیت اور ان جیسے محبوب رہنما کے اُٹھ جانے کے بعد ہندوستان کی سیاست، خاص طور پر چوتھے عام انتخابات کے بعد، انتشار کا شکار ہو گئی ہے۔ ان حالات میں صدارت کی انتخابی مہم کے دوران ایسی چیزیں بھی شائع ہوئی ہیں، جو شرافت کے دامن پر بدنما داغ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ذاکر صاحب کی حساس طبیعت سے جو لوگ واقف ہیں، وہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس زمانے میں ان کے دل و دماغ پر کیا بیتی ہوگی۔ بعض تنگ نظر اور گھٹیا قسم کے اخبارات پڑھ کر مجھے ذاکر صاحب کے وہ فقرے یاد آ گئے، جو انھوں نے افلاطون کے متعلق کبھی لکھے تھے:

"یہ نوجوان دیکھتا تھا کہ جماعتی زندگی کا یہ سب سے دشوار اور سب سے اہم کام، حکومت کرنے کے لیے، ہر کس و ناکس، ہر چھوٹا بڑا، ہر اچھا برا، آمادہ بلکہ کوشاں ہے۔ یہ سمجھتا تھا کہ یہ جمہوری ریاست ایک بے ملاّح کی ناؤ ہے، کہاں دیکھیے تھمے۔ پھر جمہوریت کا یہ سیاسی طوفانِ بے تمیزی اس شریف زادہ کے لیے سوہانِ روح تھا۔"

لیکن اطمینان اور خوشی کی بات یہ ہے کہ ایک مخصوص جماعت کے علاوہ اس سلسلے میں کسی اور نے تنگ نظری اور اتحاد دشمنی سے کام نہیں لیا اور ملک کی بڑی تعداد نے ذاکر صاحب کی مخلصانہ خدمات کا اعتراف کیا، ان کی شرافت اور تدبّر کی سراہنا کی اور ان کی حمایت میں انگریزی اخبارات میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں خطوط شائع ہوئے۔ اور اب ان کی شاندار کامیابی کے بعد ہندوستان اور دُنیا کے تمام گوشوں سے مشاہیر کے جو پیغامات موصول ہوئے ہیں، ان میں ان کی عظمت اور خدمات کا بڑے شاندار لفظوں میں اعتراف کیا گیا ہے۔ ذاکر صاحب کی شخصیت اور خدمات کے پیشِ نظر یہ سب کچھ ہونا ہی چاہیے تھا۔ نہ ہوتا تو تعجب اور افسوس ہوتا۔ مگر دو وجہوں سے، میرے نزدیک، ان کی بڑی اہمیت ہے۔ اوّلاً اس لیے کہ ذاکر صاحب عملی سیاست سے ہمیشہ الگ رہے۔ ان کی قومی خدمات تعلیمی میدان تک محدود تھیں جن کی اہمیت کو خاص خاص لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں اور قدر کر سکتے ہیں۔ دوسرے آجکل ملک کے سیاسی حالات میں اتنی بڑی تبدیلی آ گئی ہے کہ کانگریس پہلے کی طرح مضبوط نہیں رہی اور سیاسی کارکنوں اور نیتاؤں کی وفاداریاں اپنا اعتماد کھو چکی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود

ذاکر صاحب کی، جو اقلیتی فرقے کے ایک فرد ہیں، اس جوش و خروش کے ساتھ حمایت کرنا اور اتنی بھاری اکثریت سے ملک کے سب سے بڑے عہدے کے لیے منتخب کرنا، کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سیکولر ہندوستان کی تاریخ میں اس کو سنہری لفظوں میں لکھا جائے گا۔

ذاکر صاحب سیاسی جوڑ توڑ کے آدمی نہیں ہیں۔ انھوں نے عمر کا بڑا اور بہترین حصہ تعلیم کی خدمت میں کھپایا اور ہنگامی سیاست سے کُلیتاً الگ تھلگ رہے۔ مگر انھیں اپنی شرافت، نیکی، رواداری اور دل موہ لینے والے اندازِ گفتگو سے مخالفوں کو رام کرنے، دشمنوں کو دوست بنانے، اور دوستوں کی دوستی کو برقرار رکھنے کا گُر خوب آتا ہے۔ انھوں نے انتہائی مشکل حالات میں جامعہ ملیہ کو چلایا اور اس کو ترقی دی۔ اس سے زیادہ مشکل حالات میں مسلم یونیورسٹی کو نہ صرف تباہی سے بچایا، بلکہ بڑی حد تک اس کی اصلاح کی۔ متعدد شعبوں کا اضافہ کیا، نئی عمارتوں کے لیے بڑی بڑی رقمیں حاصل کیں اور قوم و ملک کے دل میں اس کے کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کیا۔ ہندوستان کا صدرِ جمہوریہ اگرچہ محض دستوری سربراہ ہوتا ہے، اصل اقتدار پارلیمنٹ کو حاصل ہے، مگر ذاکر صاحب کے تدبّر اور ان کی محبوب شخصیت کی بنا پر یقین ہے کہ موجودہ حالات میں، جب کہ حکومت کے اندر کوئی بزرگ اور بااثر شخصیت نہیں رہی اور مرکز اور ریاستوں کے درمیان کشمکش کا شدید اندیشہ ہے، ان کا صدرِ جمہوریہ منتخب ہونا، ملک کے لیے یقیناً فالِ نیک ہے۔

ذاکر صاحب کی شخصیت ملکی مسائل کے حل کرنے میں جس قدر مدد و معاون ہو سکتی ہے، اسی قدر اس سے بیرونی ممالک سے تعلقات کو استوار کرنے اور ان کو خوشگوار بنانے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے نائب صدرِ جمہوریہ کے پانچ سالہ دور میں بڑے مفید اور دور رس کارنامے انجام دیے ہیں۔ سربراہ مملکت کی حیثیت سے وہ پہلے سے بھی زیادہ مفید خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ ہمارے بعض پڑوسی ملک دن رات اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ بیرونی ملکوں سے خاص طور پر مسلمان ملکوں سے ہمارے دوستانہ تعلقات باقی نہ رہیں۔ اسلامی ملکوں

میں وہ ہمارے خلاف انتہائی زہریلے پروپگنڈے کرتے رہتے ہیں۔ اس کا بہترین جواب ذاکر صاحب کی یہ شاندار کامیابی ہے۔

ذاکر صاحب جب قومی تعلیم کے ایک گمنام خادم اور ایک چھوٹے سے تعلیمی ادارے کے سربراہ تھے۔ اپریل ۱۹۴۱ء میں جامعہ ملیہ میں بنیادی تعلیم کی دوسری کانفرنس کے موقع پر ہمارے قومی رہنما بابو راجندر پرساد کی معرفت ملک کے سب سیاسی رہنماؤں سے اپیل کی تھی:

"خدا کے لیے اس ملک کی سیاست کو سدھاریے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالیے جس میں قوم، قوم پر بھروسہ کر سکے، کمزوروں کو زور آور کا ڈر نہ ہو، غریب، امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے۔ جس میں تمدن، تمدن امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو پھول پھل سکیں اور ہر ایک سے دوسرے کی خوبیاں اُجاگر ہوں، جہاں ہر ایک وہ بن سکے جس کے بننے کی اس میں صلاحیت ہے اور وہ بن کر اپنی ساری قوت کو اپنے سماج کا چاکر جانے۔ میں جانتا ہوں کہ ان باتوں کا کہہ دینا سہل ہے اور کرنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ آج یہ بات ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھوں میں اتنی ہے جتنی پہلے کبھی نہ تھی کہ کچھ سمجھ کر کچھ سمجھا کر، کچھ مان کر کچھ منوا کر ایسی ریاست کی نیو رکھ دیں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا ہم تعلیمی کام کرنے والوں کا حال قابلِ رحم ہے۔ ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں، کب تک شبہے اور بدگمانی کے دھوئیں میں تعلیم کو دم گھٹ گھٹ کر سسکتے دیکھیں، کب تک ہم اس ڈر سے تھراتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محبت کو کوئی ایک سیاسی حماقت، کوئی ایک سیاسی ضد بھسم کر دے گی۔ ہمارا کام بھی کوئی پھولوں کی سیج تو ہے نہیں، اس میں بھی بہت مایوسیاں ہوتی ہیں اور اکثر دل ٹوٹتا ہے۔ پھر جب ہمارے قدم ڈگمگائیں تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈیں؟ کیا اسی سماج میں جہاں بھائی بھائی ایک دل نظر نہیں آتے،

کوئی قدر آخری قدر نہیں معلوم ہوتی۔ جس میں کوئی گیت نہیں جو سب مل کر گائیں، کوئی تہوار نہیں جو سب مل کر منائیں، کوئی شادی نہیں جو سب مل کر رچائیں، کوئی دُکھ نہیں جو سب بٹائیں۔ ہماری یہ مشکل دور کیجیے اور جلد کیجیے۔ اب بھی بہت دیر ہو چکی ہے اور دیر نہ جانے کیا دن دکھلائے۔"

اب وہ خود سربراہِ مملکت ہیں اس وقت بھی ملک کی صورتِ حال ۱۹۴۷ء سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اس لیے بجا طور پر ان سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے شخصی اثرات کو ملک کے فرقہ وارانہ حالات کو بہتر بنانے میں استعمال کریں گے۔ لیکن جہاں ہم ذاکر صاحب کی محبوب اور ہر دلعزیز شخصیت سے بہت سی توقعات رکھنے میں حق بجانب ہیں، وہاں موجودہ صورتِ حال کی نزاکت اور اُلجھاؤ کے پیشِ نظر یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ان کے ہاتھ میں کوئی جادو کی چھڑی نہیں ہے کہ ملک و قوم کی تمام خرابیوں کو، جن کی جڑیں بڑی گہری اور مضبوط ہیں، اپنے مختصر عہد میں دور کر دیں گے۔ علاوہ ازیں وہ انسان ہیں، فرشتہ نہیں۔ ان میں کمزوریاں بھی ہیں۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری مروّت ہے۔ ایک حساس اور دردمند دل رکھتے ہیں۔ جو سماج کی خرابیوں اور بے انصافیوں پر بہت جلد بھر آتا ہے، وہ وضعداری کو قائم رکھنا اور انسانیت کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ قاعدوں اور ضابطوں کے وہ قائل ہیں، بشرطیکہ وہ پیر کی بیڑی ثابت نہ ہوں، اعلیٰ قدروں کے فروغ میں مدد و معاون ہوں۔ مگر وہ جس اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے ہیں، اس کے ارد گرد روایتوں اور قاعدوں کا ایسا مضبوط حصار ہے جسے نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ ان سے توقعات قائم کرتے وقت اس پہلو کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

بہرحال ذاکر صاحب کا صدرِ جمہوریہ کے عہدے کے لیے منتخب ہونا بذاتِ خود بہت بڑا واقعہ ہے۔ ہم اس انتخاب پر قوم کو مبارک باد دیتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ جس طرح اس نے انتخاب کے وقت اپنے فیصلے کو تعصب اور جانبداری سے ملوث ہونے نہیں دیا، اسی طرح اپنا غیر مشروط تعاون پیش کر کے انھیں قوم و ملک کی خدمت کا بہترین موقع دے گی۔

ہم ذاکر صاحب کو بھی مبارک باد دیتے ہیں جن کو ملک کے سب سے بڑے عہدے پر منتخب کر کے قوم نے ان پر کوئی احسان نہیں کیا ہے، ملک کے وقار کو دنیا کی نظروں میں اونچا کر کے خود اپنے اوپر احسان کیا ہے۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ قوم نے ذاکر صاحب پر جس اعتماد اور یقین کا ثبوت دیا ہے اس میں اسے کبھی مایوسی نہیں ہوگی۔

ہندوستان نے ایک مسلمان کو صدر جمہوریہ منتخب کر کے کچھ تو لاج اپنے سیکولر ہونے کی رکھ لی۔ اس پر مبارکباد کے مستحق خود صدر موصوف نہیں، ان کے انتخاب کرنے والے ہیں۔

ہمارے ذاکر صاحب کی سیرت و کردار کا خلاصہ کوئی ایک لفظ میں اگر رکھ دینا چاہے تو وہ ایک لفظ شرافت ہوگا۔ شرافتِ نفس کے نمونے یوں تو وہ زندگی بھر اور بہ کثرت پیش کرتے رہے ہیں، لیکن اس کا سب سے بڑا اور سب سے پُر اثر نمونہ تو عین اسی الکشن کے سلسلے میں دیکھنے میں آیا۔ معاندین میں سے بعض تو رذالت کی جس پست ترین سطح پر اُتر آئے تھے، اس پر ہر آنکھ حیران اور ہر کان دنگ تھا۔ اتنے صبر آزما حملوں کا جواب اس پر وقار خاموشی سے دینا، بس انھیں کا حصّہ تھا۔ بقول شاعر

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مُردے نکل پڑے
یہ مری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی، دھری رہی

(مولانا عبدالماجد دریابادی)

طرزِ نگارش کے چند نمونے

ذاکر صاحب کا اپنا مخصوص اور منفرد طرزِ نگارش ہے، جو بہت دلکش، بہت پرجوش اور خطیبانہ ہے اور بچّوں کی کہانیوں میں ان کی نفسیات کا لحاظ رکھتے ہوئے بڑے سیدھے سادے انداز میں بڑے پتے کی باتیں لکھ جاتے ہیں۔ اس موضوع پر آل احمد سرور صاحب، محمد سرور صاحب اور عبداللہ ولی بخش قادری صاحب نے اپنے مضامین میں بہت کافی روشنی ڈالی ہے۔ میں ان کے طرزِ نگارش کے چند نمونے بغیر کسی تبصرے کے یہاں پیش کرتا ہوں۔

اسلوب بیان ہو یا طرزِ نگارش، موضوع کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے چنانچہ ذاکر صاحب کی مختلف تحریروں میں مختلف انداز ملے گا۔ خطبوں میں خطابت اور جوش و خروش کی فراوانی ہے۔ رفتارِ زمانہ پر تبصرہ کرتے ہیں تو موقع موقع سے لطیف طنز ملے گا اور علمی مضامین میں دلکشی کے ساتھ سنجیدگی اور گمبھیرتا نظر آئے گی۔ ذیل میں جو نمونے پیش کیے جا رہے ہیں وہ ان تینوں موضوعات پر الگ الگ ہیں:

علمی موضوعات

"انسانی زندگی، ذہنی زندگی یعنی جماعتی زندگی ہے۔ ساری ذہنی زندگی کا خاصہ ہے کہ وہ اجتماع میں یا کم سے کم دوئی سے پیدا ہوتی ہے۔ حیات انفرادی کا پودا جماعت کی نمو بخش فضا ہی میں پرورش پاتا ہے۔ من و تو، یکساں طور پر ذہنی زندگی کے لوازم ہیں۔ بچہ ہی ماں کو ماں بناتا اور اس میں وہ ساری ذہنی خصوصیات پیدا کر دیتا

ہے، جو عورت میں محض بحیثیت جنس نہیں ہوتیں ؛ اور ماں ہی اپنی محبت اور شیفتگی سے بچے کی ذہنی زندگی کو وہ متاعِ گراں مایہ دے سکتی ہے، جس کا بدل دُنیا کی اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ اچھا استاد شاگرد سے اور اچھا شاگرد استاد سے، سچا گرو چیلے سے اور سچا چیلا گرو سے وہ منازل ذہنی و روحانی طے کرا دیتا ہے جو اس کے بغیر ناقابلِ تصور ہوتے۔ جس زندگی کے ساز کو کسی دوسری زندگی کا مضراب نہیں چھیڑتا اس کے نغمے خاموش ہی رہتے ہیں۔ جس زندگی کی کلی کو دوسری زندگی کی حیات بخش شبنم نہیں نصیب ہوتی وہ شگفتہ ہونے کی جگہ مرجھا جاتی ہے۔ فلاطون کی زندگی کی کلی اس وقت کھلی جب اس پر اس انوکھے بوڑھے سقراط کی نظر بہار اثر پڑی۔"

(مقدمہ "ریاست" مطبوعہ ۱۹۳۲ء صفحہ ۲)

خطابت اور اثر آفرینی

کاشی ودّیا پیٹھ (بنارس) کے فارغ التحصیل طالب علموں کو مخاطب کرکے ذاکر صاحب فرماتے ہیں:

"تم جس دیس میں یہاں سے نکل کر جارہے ہو، وہ بڑا بدنصیب ملک ہے، وہ غلاموں کا ملک ہے، بے رحمیوں کا ملک ہے، ظالمانہ رسموں کا ملک ہے، غافل پجاریوں کا ملک ہے، بھائی بھائی میں نفرت کا ملک ہے، بیماریوں کا ملک ہے، سستی کا ملک ہے، افلاس اور ناداری کا ملک ہے، بھوک اور مصیبت کا ملک ہے، غرض بڑا کم بخت ملک ہے۔ لیکن کیا کیجے تمھارا اور ہمارا ملک ہے۔ اسی میں جینا ہے اور اسی میں مرنا ہے۔ اس لیے یہ ملک تمھاری ہمتوں کے امتحان، تمھاری قوتوں کے استعمال اور تمھاری محبّت کی آزمایش کی جگہ ہے۔

ممکن ہے کہ اپنے چاروں طرف اتنی تباہی، اتنی مصیبت، اتنا ظلم دیکھ کر بے صبری میں یہ چاہو، جیسے بہت سے نوجوان چاہنے لگتے ہیں کہ اس میں بسنے والی سماج ہی کو ختم کردو اور برباد کر ڈالو، اس لیے کہ اس میں سدھار کی کوئی صورت نہیں۔ تمھیں اختیار ہے۔ مگر اپنے ایک بھائی کی رائے سن لینے میں بھی کیا نقصان ہے۔ سو میرا خیال یہ ہے کہ تباہی سے ہمارا کام کچھ سہل نہیں ہوگا۔ تباہی تو پہلے ہی سے کافی موجود ہے۔ قومی زندگی کا کون سا

شعبہ ہے جس میں پہلے سے تباہی کا دور دورہ نہیں ؟ لیکن ہماری بے شمار بیماریوں اور ان گنت مصیبتوں میں سے ایسی بہت کم ہیں کہ ہم یکایک گرما کر تھوڑی سی دیر میں انھیں ختم کر ڈالیں ۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں بگاڑنا اتنا نہیں ہے جتنا کہ بنانا ہے ۔ ہمارے دیس کو ہماری گردنوں سے اُبلتے خون کے دھارے کی ضرورت نہیں ہے ، بلکہ ہمارے ماتھے کے پسینے کا بارہ ماسی بہنے والا دریا درکار ہے ۔ ضرورت ہے کام کی ، خاموش اور سچے کام کی ۔ ہمارا مستقبل کسان کی ٹوٹی جھونپڑی ، کاری گر کی دھوئیں سے کالی چھت اور دیہاتی مدرسے کے پھوس کے چھپّر تلے بن اور بگڑ سکتا ہے ۔ سیاسی جھگڑوں ، کانفرنسوں اور کانگریسوں میں کل اور پرسوں کے قصّوں کا فیصلہ ہو سکتا ہے ۔ لیکن جن جگہوں کا نام میں نے لیا ان میں صدیوں تک کے لیے ہماری قسمت کا فیصلہ ہوگا اور ان جگہوں کا کام صبر چاہتا ہے اور استقلال ۔ اس میں تھکن بھی زیادہ ہے اور قدر بھی کم ہوتی ہے جلدی نتیجہ بھی نہیں نکلتا ۔ ہاں کوئی دیر تک صبر کر سکے تو ضرور پھل میٹھا ملتا ہے ۔"

(خطبۂ کانووکیشن مورخہ ۱۴ اگست ۳۵ سنہ ء)

جامعہ ملیہ کے جشن سیمیں کے موقع پر پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے وزیروں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں :

"آج ملک میں باہمی نفرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے ۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے ، اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے ؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے ؟ بربریت کے دور دورے میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے ؟ اس کے نئے خدمت گزار کیسے پیدا کر سکیں گے ؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے ؟ یہ لفظ شاید کچھ سخت معلوم ہوتے ہوں ۔ لیکن ان حالات کے لیے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں ، اس سے سخت لفظ بھی بہت نرم ہوتے ۔ ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں ، آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں ! شاعرِ ہندی نے کہا تھا کہ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس

نہیں ہوا، مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو بھی کھلنے سے پہلے مسل دینا چاہتا ہے، خدا کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیے اور اس آگ کو بجھائیے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی۔ آگ لگی ہوئی ہے، اسے بجھائیے۔ یہ مسئلہ اس قوم اور اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے، مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ درندگی میں انتخاب کا ہے۔ خدا کے لیے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو یوں کھدنے نہ دیجیے۔"

(جامعہ کے پچیس سال مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۴۶ء)

سیاسی تبصرے

اس مجموعے میں پروفیسر آل احمد سرور کا جو مضمون شامل ہے، اس میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "رفتارِ زمانہ پر ان کے (ذاکر صاحب کے) خصوصاً بیرونی ممالک کی سیاست پر ان کے تبصرے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔" (صفحہ ۱۱۸) اس کا نمونہ ملاحظہ ہو — ہٹلر کی جرمنی کے سیاسی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"..... یوں تو جب کوئی شخص اس سیڑھی کو توڑنے لگے جس سے وہ چھت پر چڑھا ہے تو اس کے سر کے بل گرنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لیکن فی الحال ہٹلر کا اقتدار قائم ہے اور شاید پہلے سے زیادہ مضبوط ہے۔ چنانچہ جب ان واقعات کے بعد اپنی قوم کے محبوب صدر ہنڈنبرگ نے دنیا کو خیر باد کہا تو ہٹلر نے دستور اساسی کے بالکل خلاف صدارت اور وزارت عظمیٰ کے عہدوں کو ملا دیا اور دونوں کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ۱۹ اگست (۱۹۳۴ء) کو جرمنی میں استفسار عام کے ذریعے معلوم کیا جائے گا کہ قوم اس کارروائی کو پسند کرتی ہے یا نہیں اور اس میں کون شک کر سکتا ہے کہ ۹۰ فی صدی سے زیادہ رائیں اس کی موافقت میں ہوں گی۔ لیکن جو قوتیں درحقیقت متصادم ہیں ان کا فیصلہ ان ظاہری استفسارات سے نہ ہوگا۔ جرمن قومی زندگی میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنے کا کام، اس کے داخلی تضاد کو مٹانے کا فرض ہٹلر کو انجام دینا ہے۔ اگر وہ یہ کر سکا تو ہمیشہ اپنی قوم کی آنکھ کا تارا رہے گا، ورنہ عارضی کامیابی پانے والا مجرم تو ہے ہی۔"

(ماہنامہ جامعہ بابت ماہ اگست ۱۹۳۴ء صفحات ۲۰۱ و ۲۰۲)

ذاکر صاحب کی کتابیں

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو قدرت نے تصنیف و تالیف کی بہترین صلاحیتیں عطا کی ہیں، مگر قومی فرائض کی ادائگی میں انھیں وہ اطمینان اور سکون میسر نہ آسکا جو تصنیف و تالیف کے لیے ضروری ہے۔ انتہائی مصروفیت کے باوجود انھوں نے جو کتابیں لکھی یا ترجمہ کی ہیں، ان کی تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ ان کے بیشمار مضامین ہیں۔ جو ماہنامہ جامعہ اور دوسرے رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ اگر ان کا انتخاب کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے تو اردو ادب میں بہترین اضافہ ہوگا۔

۱۔ مبادی معاشیات   از ایڈون کینن

سال طباعت: ۱۹۲۲ء

یہ کتاب مسٹر ایڈون کینن (پروفیسر معاشیات لندن یونیورسٹی) کی کتاب "ایلی منٹری پولٹیکل اکانمی" کا ترجمہ ہے اور ذاکر صاحب نے اس کا ترجمہ اس وقت کیا تھا جب وہ صرف بی اے تھے۔ جناب نورالرحمٰن صاحب نے، جو اس وقت جامعہ ملیہ علی گڑھ کے شعبۂ تصنیف و تالیف کے ناظم تھے، اس کتاب کے لیے دیباچہ لکھا ہے، جس میں ترجمے کے متعلق یہ رائے ظاہر کی گئی ہے:

"ترجمے کے متعلق صرف اس قدر عرض کرنا کافی ہے کہ علمی کتابوں کے

ترجمے میں جس قدر دشواریاں وضع اصطلاحات وغیرہ کے متعلق پیش آتی ہیں، ان کے علاوہ علم المعیشت میں مثالوں کا اختلاف بھی نہایت سخت مشکلات پیدا کرتا ہے ..... لیکن جناب مترجم نے جس خوبی سے ان تمام دشواریوں کو حل کیا ہے۔ اس کا اندازہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے۔ جس نے اس قسم کی مشکلات کا سامنا کیا ہے۔
اردو زبان کی بے مائگی اور اس میں اصطلاحات علمی کی کمی کے باوجود مترجم نے کتاب کے نفس مضمون کو نہایت صفائی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس زبان کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ بادی النظر میں یہ کتاب ترجمہ نہیں بلکہ اصل تصنیف معلوم ہوتی ہے اور یہ خصوصیت ذاکر حسین خاں صاحب کی بے مثل ترجمانی کا فیض ہے۔"

۲۔ ریاست از افلاطون

سال طباعت: ۱۹۳۲ء

افلاطون کی اس مشہور کتاب "ریاست" یا "تحقیق عدل" کے ترجمے کے بارے میں بعض ادیبوں نے لکھا ہے کہ اگر خود افلاطون اردو میں لکھتا تو اس سے بہتر نہیں لکھ سکتا تھا۔ اس کتاب میں فاضل مترجم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا ایک مبسوط مقدمہ شامل ہے جو بجائے خود بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں فاضل مترجم نے کتاب کے بارے میں لکھا ہے:

"یہ کتاب، جو افلاطون کے شجر علم کا پختہ ثمر ہے، ہم تک دو ناموں سے پہنچی ہے: ریاست اور تحقیق عدل۔ ان ناموں سے یہ سمجھ لینا کہ یہ سیاست یا قانون پر ایک تصنیف ہے، غلط ہوگا۔ سچ یہ ہے کہ اس میں انسان کی پوری زندگی پر نظر ڈالی گئی ہے، البتہ زیادہ تر توجہ انسانی زندگی کے عملی پہلو پر ہے۔ اس لیے کتاب کا زیادہ حصہ اخلاقی اور سیاسی مسائل سے پُر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ نہیں ہے کہ فکر و خیال کی دنیا کو یک قلم نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ فلسفہ کی بلندیاں

دیکھنی ہوں تو عین خیر میں سب چیزوں کے اتحاد کا جلوہ اس کتاب
میں دکھائی دیتا ہے؛ اخلاق کا سبق لینا ہو تو اس میں روحِ انسانی
کے محاسن کی گہری اور لطیف تحقیق موجود ہے؛ تعلیم کے مسائل پر
روشنی درکار ہو تو بقول روسو "فن تعلیم پر آج تک جتنی کتابیں لکھی
گئیں ان میں یہ سب سے بہتر ہے"؛ سیاسی زندگی میں رہنمائی کے لیے
یہ ایک جدید ہیئت اجتماعی اور اس کے اداروں کی جیتی جاگتی
تصویر لاکر کھڑی کر دیتی ہے اور انسانی جماعتوں کے بغیر، عروج و
زوال کے اسرار سربستہ کی کنجی کی تلاش ہو تو فلسفۂ تاریخ کے
یہ مشکل مسائل بھی اس میں بیان کر دیے گئے ہیں" (صفحہ ۱۰)
مقدمے پر ۲۰؍ فروری ۳۲ء کی تاریخ درج ہے۔

۳۔ معاشیات : مقصد اور منہاج

یہ دراصل طویل مقالہ ہے جو ہندوستانی اکیڈیمی یوپی (الہ آباد) کی درخواست
پر لکھا گیا تھا اور ۵،۶،۷؍ مارچ ۱۹۳۲ء کو وہاں پڑھا گیا۔ فاضل مصنف نے
اس کتاب کا "تہدیہ" اپنے استاد کے نام کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں، "ان مقالوں میں
اگر کچھ توجہ کے قابل ہو تو وہ ہے، جو میں نے اپنے محترم اور شفیق استاد پروفیسر
اوبرزومبارٹ، استاد جامعہ برلن کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر اور ان کی تصانیف کو
پڑھ کر سیکھا۔ اس لیے اپنی اس طالب علمانہ کوشش کو ان کے نام نامی سے منسوب
کرتا ہوں"

اس کتاب میں تمہید کے علاوہ تین باب ہیں جن کے عنوانات یہ ہیں (۱) معاشیات
معیاری (۲) معاشیات ترتیبی (۳) معاشیات افہامی

۴۔ تعلیمی خطبات

تاریخ اشاعت : مارچ ۴۳ء

یہ کتاب ذاکر صاحب کے ان خطبوں کا مجموعہ ہے جو مختلف کانفرنسوں میں

تعلیمی مسائل پر اور ان تقریروں کا جو آل انڈیا ریڈیو سے تعلیم و تربیت پر نشر کی گئی ہیں۔ جامعہ ملیہ کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب میں نے مکتبہ جامعہ میں کام شروع کیا تو ذاکر صاحب کے خطبوں اور تقریروں کو جمع کرنے کا خیال آیا، بالکل اسی طرح، جس طرح ذاکر صاحب پر لکھے ہوئے مضامین کی ترتیب کا اس وقت خیال آیا۔ اگر اس وقت ان کو جمع نہ کیا گیا ہوتا تو خطبے تو شاید بعد میں مل جاتے، مگر ریڈیو کی تقریریں یقیناً ضائع جاتیں۔ اس وقت بھی ان کو حاصل کرنے میں بڑی دوڑ دھوپ کرنی پڑی تھی اور بڑی دقتوں کے بعد ان کی نقلیں حاصل ہو سکی تھیں۔ اس کے بعد ذاکر صاحب نے اردو میں جتنے تعلیمی خطبے دیئے ہیں، بعد کے ایڈیشنوں میں ان کو شامل کر لیا گیا ہے۔

اس کتاب میں ذاکر صاحب کی انشا اور خطابت کے بہترین نمونے ملتے ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں میں یہ سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ ۱۹۴۳ء سے اب تک اس کے چھ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ (آخری ایڈیشن ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا ہے)۔ جو اردو کی کتابوں کے لیے غیر معمولی بات ہے۔

۵۔ معاشیات قومی

مصنف: فریڈرش لسٹ

تاریخ اشاعت: اپریل ۱۹۴۶ء

ذاکر صاحب نے اس کتاب کو براہِ راست جرمن زبان سے ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ بہت پہلے کیا گیا تھا، مگر طباعت کی نوبت ۱۹۴۶ء میں آئی۔ فاضل مترجم نے مصنف کے حالات اور خیالات کے بارے میں بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ کتاب کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"لسٹ کے یہ خیالات اس کی بہت سی چھوٹی بڑی کتابوں رسالوں اور بیشمار منصوبوں میں طرح طرح سے پیش کیے گئے ہیں، لیکن ان کا سب سے واضح اور مؤثر اظہار اس کی "معاشیاتِ قومی" میں ملتا ہے۔ اکثر ناقدوں نے کہا ہے کہ اس کتاب کو خالص علمی اور تحقیقاتی معیاروں سے نہ جانچنا چاہیے۔ اس میں کہیں کہیں جزوی واقعات

کی غلطیاں بھی ہیں، لیکن اس سے شاید انکار نہ ہو سکے کہ بہ حیثیت مجموعی یہ ایک نرالی کتاب ہے اور ایک دور بیں دماغ کے صحیح اور عمیق وجدان علمی و عملی کا پتہ دیتی ہے۔ اس سے فکر و عمل کی نئی راہیں کھلتی ہیں...“

۶۔ ہندوستان میں تعلیم کی از سر نو تنظیم

مصنف: ڈاکٹر ذاکر حسین

مترجم: ڈاکٹر سید عابد حسین

تاریخ اشاعت: مئی ۶۲ء

مشہور قومی رہنما سردار ولبھ بھائی پٹیل کی یادگار کے طور پر مرکزی وزارت اطلاعات و نشریات کی طرف سے ۱۹۵۵ء میں لکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کے مطابق ہر سال کسی ممتاز شخصیت کو کسی اہم موضوع پر انگریزی میں مقالہ پڑھنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ چوتھے لکچر کے لیے ۱۹۵۸ء میں ملک کے ممتاز ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو، جو اُس وقت ریاست بہار کے گورنر تھے، مدعو کیا گیا اور انھوں نے ۱۲، ۱۳، اور ۱۴ دسمبر کو یہ لکچر دیے۔ ”ان میں ہندوستان کے نظامِ تعلیم کا سائنٹفک تجزیہ کیا گیا ہے اور تعلیم عامہ کے سربراہوں کو نئے طرز کے تعلیمی منصوبے بنانے اور ان پر عمل کرنے کے بارے میں بصیرت افروز ہدایتیں دی گئی ہیں۔“ انھوں نے اس کتاب میں ایک جگہ فرمایا ہے کہ ”تعلیم بے اصول اور مطلق العنان حکمرانوں کے ہاتھ میں ایک بڑا خطرناک ہتھیار ہے، جو انسان کی حقیقی نشو و نما کے لیے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔“

۷۔ ابّو خاں کی بکری اور دوسری کہانیاں

ذاکر صاحب نے بچّوں کے لیے جو کہانیاں لکھی تھیں، یہ ان کا مجموعہ ہے۔ ان کہانیوں کے بارے میں اس کتاب میں ایک مفصّل مضمون شامل ہے، اس لیے یہاں کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہیں۔

اردو میں ذاکر صاحب کی کل یہی سات کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ بعض لوگوں نے بعض اور کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ مثلاً ”ہندوستانی کیا ہے؟“، ”ذکرِ حسین“، ”حالی — محبِ وطن“۔ مگر یہ مضمون ہیں جنھیں بعض لوگوں نے اپنی ضرورت کے لیے کتابی صورت

میں شائع کر دیا ہے۔ یہ ہندوستانی کیا ہے؟ بیں ذاکر صاحب کا صرف ایک مضمون ہے، بقیہ دوسروں کے ہیں۔

انگریزی تصنیفات

CAPITALISM

ESSAYS IN UNDERSTANDING

ذاکر صاحب نے ۱۹۳۲ء میں دہلی یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر سر موریس گائر کی خواہش پر وسٹ لکچر دیے تھے۔ یہ کتاب ان ہی لکچروں کا مجموعہ ہے جو اسی زمانے میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۶۶ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ ذاکر صاحب کا اصل مضمون معاشیات ہے، اس لیے ان کی کتابوں میں اس کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہے۔

EDUCATIONAL RECONSTRUCTION IN INDIA

تاریخ اشاعت: ستمبر ۱۹۵۹ء

اس کے بارے میں تفصیل "ہندوستان میں تعلیم کی از سرِ نو تنظیم" میں ملاحظہ ہو۔

THE DYNAMIC UNIVERSITY

سنہ اشاعت: ۱۹۶۵ء

یہ کتاب ذاکر صاحب کے ان تعلیمی خطبوں کا مجموعہ ہے جو مختلف کانووکیشن کے موقع پر انگریزی میں دیے گئے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب کے رفیقِ کار اور مشہور ماہرِ تعلیم پروفیسر محمد مجیب صاحب کا مختصر پیش لفظ بھی شامل ہے۔